قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

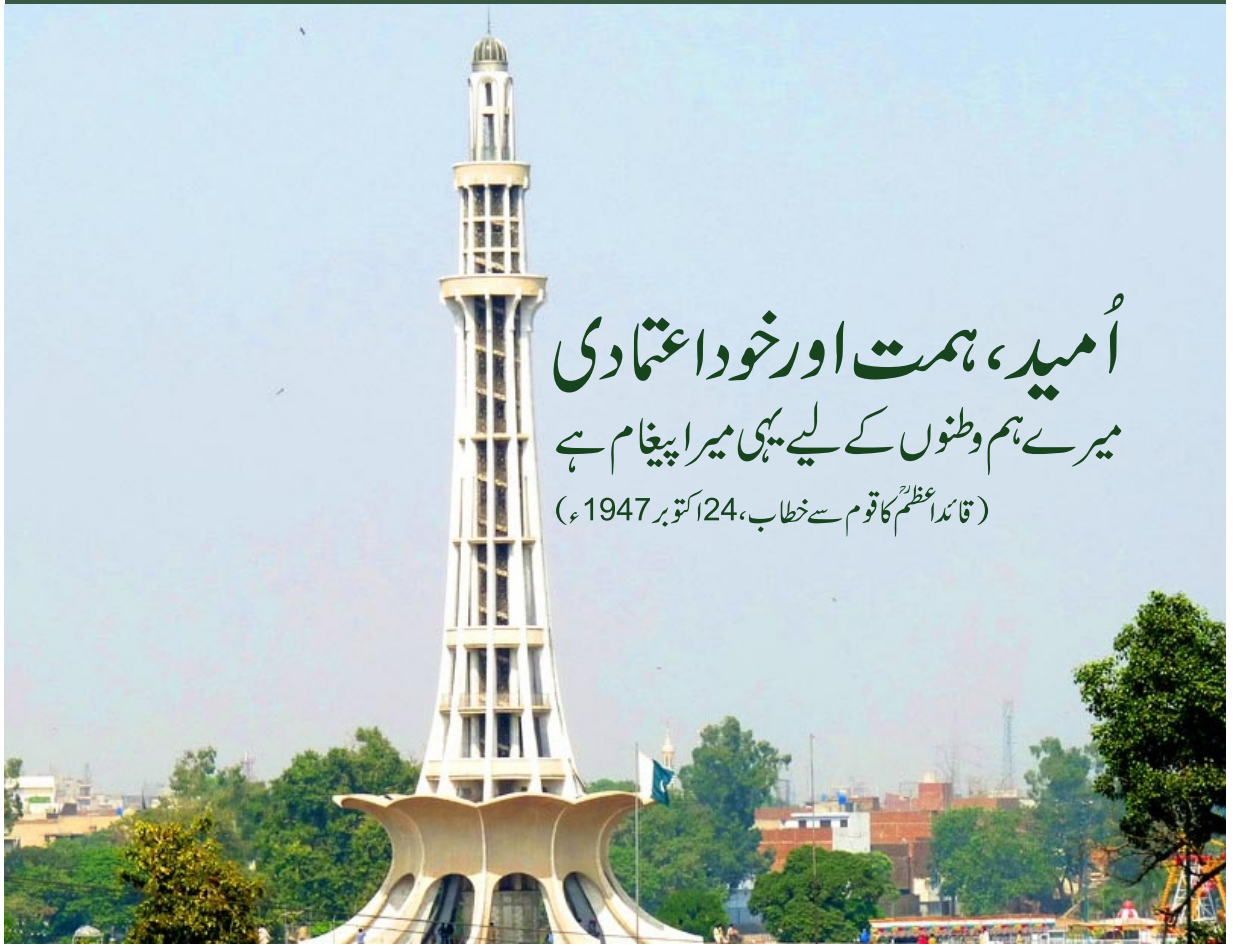
طلوعِ اسلام

لاہور

مارچ 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



اُمید، ہمت اور خود اعتمادی

میرے ہم وطنوں کے لیے یہی میرا پیغام ہے

(قائداعظمؒ کا قوم سے خطاب، 24 اکتوبر 1947ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

مارچ 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 03

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: 1940ء کا ریزولیوشن کن حالات میں پاس ہوا تھا؟	ادارہ	4
میری ڈائری کا ایک ورق	محمد خالد گل، سعودی عرب	9
یہ تھا نظامِ مصطفیٰ ﷺ	غلام احمد پرویز	10
دولت کی پیدا کردہ بیماریاں	ڈاکٹر زاہدہ درانی، لاہور	20
اسلام خطرے میں ہے	ادارہ	24
بچوں کا صفحہ: زبان سنبھال کر بولو	ادارہ	30
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر 4)	محمد علی صابر صدیقی	32
خواتین کا صفحہ: عورت اور قرآن	جمیلہ خاتون پالوی، بھارت	39
اسلامی نظام کے قیام سے مقاصد عالیہ حاصل ہوتے ہیں	خواجہ ازہر عباس، کراچی	42
قرآن: جدید تحقیقات کی روشنی میں	عبداللہ ثانی، پشاور	49
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	52

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

ENGLISH SECTION

The Sunrise of Humanity (*Tulu-e Aftaab* طلوع آفتاب)
Meraj-e Insaaniyat (The Pinnacle of Humanity)
by G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) 59

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو، گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے
بیا پیدا خریدارست جانِ ناتوانے را
''پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

1940ء کا ریزولیوشن کن حالات میں پاس ہوا تھا؟

23 مارچ 1940ء کی اہمیت کیا ہے، بہت کم لوگوں کو معلوم (یا کم از کم یاد) ہوگا کہ وہ حالات کس قسم کے تھے جن میں وہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اسی زمانے میں ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ موقعہ کی مناسبت کے لحاظ سے آپ بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔ طلوعِ اسلام نے لکھا تھا:

''اللہ رے بساطِ سیاست کی فسوں گرانہ مُہرہ بازیاں! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی۔ وہائٹ ہال کے اربابِ حل وعقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک ❶ لاہور کی طرف لگ رہی تھیں۔ رام گڑھ ❷ میں جمع ہونے والے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف، ہر پتہ کھٹکنے پر کھڑے ہو رہے تھے۔ انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خواب پریشاں بنتے نظر آ رہے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں کہ جس کے حلقے انگریز کی ہوسِ استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے، تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جداگانہ قوم کے لئے ایک ذرہ ذرہ اُبھرا اُبھر کر 21 مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور نوکروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جانفزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتابِ تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔ شپرہ چشم غیروں کو اس آفتابِ جہاں تاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ خود اپنوں میں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کرتے تھے۔ جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے تحیر انگیز نتائج ان کے چہروں کو بے نقاب کر دیں گے، صفِ مخالف کی بھانپنے والی نگاہوں نے ان کے چہروں کی اس اُڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا اور ایک نرم رو قاصد ❸ لاہور بھیجا گیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جس کی تفصیل کے متعلق۔ کراماً کاتبیں راہم خبر نیست، اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں گرم جوشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ آنے والے منظر کا تصور نگاہوں میں چمک، قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیفِ طیب پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں۔ ولولوں نے کروٹ بدلی۔ ہمتیں آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں، عزائم نے قدم بڑھایا۔ ارادوں نے کمر ہمت باندھی اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

---

❶ جہاں مسلم لیگ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ ❷ کانگریس کا سالانہ اجلاس زیرِ صدارت ابوالکلام صاحب آزاد۔ ❸ ابوالکلام صاحب آزاد جنہوں نے سر سکندر حیات سے ملاقات کی تھی۔

اُدھر یہ گرم جوشیاں تھیں اور اِدھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے، تبسم پنہاں، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے جا رہے تھے۔ لیکن کیفِ عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس سے منظرِ پس پردہ کا جائزہ لے لے۔ وقت گزرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے کہ عین شروع مارچ میں حکومتِ پنجاب کے قصرِ فلک بوس سے جماعتِ خاکساراں پر پابندیاں عائد کرنے کے احکامات نافذ ہو گئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اس پر بھی نہ سمجھا کہ:

ترے نشتر کی زَد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

مہینے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساروں کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا۔ کہ جلوسِ صدر مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے، شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف واکنافِ ہند میں دوڑ گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلا دی گئی ہے۔ تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہو گیا۔ دفعہ 144 نافذ کر دی گئی۔ شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں ہر متنفس متوحش، نہ باپ کو بیٹے کی خبر، نہ بھائی کو بھائی کا علم، کاروبار بند، دل پژمردہ ہمیتس پست، دل افسردہ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اور لاہور کی یہ حالت! شریک ہونے والوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے۔ کچھ ٹکٹ بدست، اسٹیشنوں پر بیٹھے۔ کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لئے ٹھہرے ہوئے۔ ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدرِ جلسہ دہلی میں ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پر تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناحؒ نے بعد میں بتایا، انہیں نہایت ''مخلصانہ'' مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور دہشت کے یہ سامان ایک طرف، اور وہ عزم وہمت کا پیکر دوسری طرف کہ نامساعدتِ حالات کی تیز وتند موجیں اُٹھتی ہیں اور اس روشنی کے بلند ومحکم مینار سے ٹکرا کر خاسر ونامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقعہ کم ہی آیا ہوگا۔ اس تدبر واستقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چُور ہو جائے گا۔ اس نے ان تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا اور 20 کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق، بلا ردوبدل ہوگا۔ البتہ اس حادثۂ الم انگیز کے پیشِ نظر کہ جس نے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانہ حزن وملال بنا دیا ہے، جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے 3 گھنٹے بعد یہ پیکرِ عزم واستقلال حسبِ انتظاماتِ سابقہ، اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازمِ لاہور ہو گیا۔

لاہور پہنچ کر قائدِ ملت نے کیا دیکھا؟ یہ تو ان کی چشمِ پُرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جن کے ایک ایک قطرہ میں سینکڑوں قیامتیں تڑپتی نظر آ رہی تھیں۔ البتہ دوسروں نے جو کچھ دیکھا اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ایک فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے لوگ اپنے آپ کو کھینچے ہوئے جانبِ قبرستان لئے جا رہے ہیں۔ چہرے اُداس، دل پژمردہ، آنکھوں میں آنسو، شہر میں ہُو کا عالم۔ ہر شخص غیر محسوس خوف سے ہراساں سینوں میں آہ وفغاں کا قیامت خیز تلاطم لیکن حلق ''قانون'' کی پابندیوں کی ریشمی رسیوں میں جکڑا ہوا۔ دل الم جانگداز کی آتشِ خاموش سے سوختہ۔ لیکن لب ''آئینی'' قیود کی مصیطرانہ بندش سے سربمہر کہ

دھواں تک نہ نکلنے پائے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا چلا بھی گیا تو اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا___ کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامن گیر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اس کی چشمِ حیرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو چپکے چپکے اس کے غم والم کی داستانِ خموش کا ایک ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیل خانہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاں کا ذرہ ذرہ ایک مستقل پاسبان ہو۔ اِدھر اُدھر استقبال کے دروازے، نیم تیاریوں کی حالت میں، دو دن پیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں، گری ہوئی جھنڈیاں، ٹوٹے ہوئے قطعات، یوں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانے والے مکانات کے بقیہ آثار، کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز، دو دن کے لئے ہوئے سہاگ کی داستانِ الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی ہے۔ کسی گھر سے ضعف ونقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں، ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانے کی فریاد بن کر کنگورۂ عرش کو ہلانے جا رہی ہے۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اس کے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے۔ کسی گوشے سے زخموں کے کراہنے کی صدائے دردناک اس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ ان کے لئے کس قدر ناقابل برداشت بن چکا ہے مشہدِ خاکساران کی خاک کے ذرات بیگناہ مسلمانوں کے خون ناحق سے رنگین قبا۔ بظاہر مرنے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ان سب کے ساتھ، شاہی مسجد کے جنوبی مینار کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے، غلطیدۂ خاک وخون، مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی اور ہوسِ خون آشامی کا شکار بن کر ذبح ہوتے دیکھا تھا، بحضور ربِ ذوالانتقام دست بدعا استادہ کہ اے خدائے رؤف ورحیم! صدقہ اس مردِ قلندر کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محوِ خواب ہے، سرزمین لاہور کو غرق ہونے سے بچا لے کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن (علامہ اقبالؒ) کی کفش بوسی کی سعادت حاصل ہے جس نے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا۔

ہاں یہ تھا لاہور اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک مردِ مخلص کا یقین محکم وعملِ پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموج پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا پنجۂ جنوں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں کے دلاویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے۔ اس کا حسن تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حُسن وخوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ 21 مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں اس مردِ مخلص نے آ کر صرف اتنا ہی کہا کہ:

> ''میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑے، اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری دادرسی ہوگی۔ حق وانصاف کا بول بالا ہوگا۔''

کہنے والے نے کچھ ایسا ہی کہا لیکن سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدۂ لاہور پر نُور کی کرنیں بن کر برسے

جنہوں نے یاس وحزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاعِ اُمید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سرِ نو روشنی پیدا ہوگئی۔ افسردہ چہروں پر خونِ نو کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر کر سطح پر دکھائی دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کرفیو آرڈر کے انسانیت سوز بھیانک عفریت کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں منتشر دکھائی دینے لگے۔ اجتماعات پر جو پابندیاں عائد ہو چکی تھیں۔ ان کی رسیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ شہر والوں کے دلوں سے پھر سے خوف و ہراس کے تب دق کے جراثیم دور ہوئے۔ قبرستان کے سے خاموش گلی کوچے پھر سے زندہ انسانوں کی بستیاں معلوم ہونے لگیں۔ پنڈال کی رونق بڑھی۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرے دن (22 مارچ) بعد دوپہر کے پہلے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہنواز خان صاحب، صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسبِ دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا۔ لیکن قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ اس میں سے وہ حصہ خارج کر دیا جائے جو خواہ مخواہ سرود بہ مستاں یاد دہانی بن جائے گا۔ پڑھتے پڑھتے حکومتِ پنجاب کے ''درخشندہ'' کارناموں کا ذکر آیا تو 19 مارچ کے حادثۂ محزنہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین ولعنت کے تہلکہ انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمانانِ لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا، آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آ گئے۔ مغموم دلوں کی وہ آتشِ خموش جو اتنے دنوں سے بایں نمط اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اس کا دھواں تک بھی اُوپر نہ اٹھنے پائے اس وقت اپنی پوری عناں تابی سے بھڑک اٹھی۔ یہ مظاہرہ محض رسمی نہ تھا کہ حلق کے اُوپر سے آوازیں اٹھ رہی ہوں۔ یہ تو عمق قلب سے نکلی ہوئی آہیں تھیں۔ جنہیں سن کر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سب کچھ سامنے تھا اور چشم فلک، عبرت و موعظت کے اس دلدوز منظر کو حیران وششدر دیکھ رہی تھی کہ اللہ اکبر! یہ کیا انقلاب ہے؟ اس کے بعد ہوا کا رُخ بدل گیا۔ اس خوف و ہراس کا ردِعمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا، پورے جوش وخروش کی صورت میں رونما ہوا۔ گوشے گوشے سے ''مردہ باد'' کے نعرے سنائی دینے لگے۔ گلی کوچے سے لعنت وملامت کی آوازیں اُٹھنی شروع ہوگئیں۔ اس کا انتظام تو کر لیا جا سکتا تھا کہ یہ چیزیں لاہور سے باہر کی دنیا تک نہ جانے پائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں نے ان باتوں کو اپنے کانوں سے سنا۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد تو رنگ ہی بدل گیا۔ کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نفرت وملامت کے نعرے بلند نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں خونِ شہداء کی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی میں پانچ پانچ گھنٹے تک بحث رہی تو اسی مسئلے پر، کھلے اجلاس میں ہر دس منٹ کے بعد تقاضا ہوا تو اسی کا۔ دو دن تک یہ ہی مطالبہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اس ہنگامۂ بحث وجدل، اس سیلابِ جوش وخروش میں مسٹر جناحؒ نے جس ہمت استقلال، عزمِ راسخ، تدبر، صلاحیت ضبط وانضباط کا ثبوت دیا۔ آنے والا مؤرخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تأمل پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ ایک ''قائداعظم'' کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا ''رہبرِ فرزانہ'' مل جائے اور مستحق صد تحسین ہے وہ

انسان جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہوجائیں۔ کامل دو دن تک یہ ہی ہنگامہ رہا اور بالآخر 23 کی شب آخری کھلے اجلاس میں جب کہ پنڈال میں کم ازکم ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔ مجمع کیا جوش وجذبات کا بحرِ متموج جو ہر متصادم عنصر کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کف بردہان موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثہ فاجعہ کے متعلق ریزولیوشن پیش کرنا۔ اسی صاحبِ ہمت، مردِ دانا کا کام تھا جسے اللہ نے اس پیرانہ سالی میں وہ جرأت وحوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرمادے۔ صاحبِ صدر (قائداعظمؒ) نے اس ریزولیوشن کو پیش کیا اور اس دردواثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ جس کے لفظ لفظ سے اس کے قلبِ محزوں کی تڑپ اور خلش اُبلتی نظر آرہی تھی۔ ریزولیوشن پیش کیا اور ایک لاکھ کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی اُٹھائی ہو۔ صاحبِ صدر نے پوچھا کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اس پر کھلے اجلاس میں بحث وتمحیص ہو۔ لیکن سب نے کہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی راہنما پر کس قدر اعتماد ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ط (62:4)

لیگ کے اجلاس کی ابتداء اور اختتام میں کیفیات وجذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری ہوچکی ہے اور مسٹر جناحؒ کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر چکی ہے۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا جو 19 مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی لیکن مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ اس میں قیامت خیز سانحہ کے نتائج وعواقب کو حسن وخوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشمِ خویش دیکھا ہے وہ محسوس کریں گے، کہ انہوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم تھا جس میں پہلے یہ دکھایا گیا کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے تو اس پر کس قدر افسردگی چھاجاتی ہے۔ اس کے قوائے عملیہ کس قدر مضمحل ہوسکتے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے حزن ویاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں ایک رہبر فرزانہ پیدا ہوجائے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضا کو بدل کے قوم کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اس کے سامنے پروگرام کیا ہے۔ اس کی تگ ودو کا منتہیٰ کیا ہے۔ اس کے سامنے نصب العین کونسا ہے؟ لاہور کے اجلاس نے واضح اور بین الفاظ میں بتادیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آرہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں دوسرے حصہ ملک سے الگ کرکے، ایک جداگانہ حکومت قائم کی جائے صدرِ مسلم لیگ، مسٹر جناح گذشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے، دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ ان کی منزلِ مقصود کیا ہے!۔

محمد خالد گل، سعودی عرب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میری ڈائری کا ایک ورق

محترم پرویزؒ صاحب جب عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب تشریف لائے تو میں اس وقت سعودی عرب میں مکین تھا۔ انہوں نے پہلے ہی مجھے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا اور وہاں کے تمام انتظامات مجھے سونپ دیے تھے۔ محترم پرویزؒ صاحب کے قیام کے دوران یوں تو ان کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ تحریر میں آنا چاہئے لیکن یہاں میں صرف ایک واقعہ ہی تحریر کروں گا۔ یہ وہ واقعہ ہے جو میرے دِل پر نقش ہے اور جسے میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔

مکہ کے بہترین ہوٹل میں ایک چھوٹا سا قافلہ پرویزؒ صاحب کے ہمراہ ٹھہرا ہوا تھا جس میں محترم محمد عمر دراز صاحب کی فیملی ور چند دوسرے احباب جو کویت سے تشریف لائے ہوئے تھے شامل تھے۔ ہم سب نے عمرہ کیا طواف کے دوران پرویزؒ صاحب اُن آیات کا ترجمہ پڑھتے رہے جو دعا حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت کی تھی۔ عمرہ مکمل ہوا تو مکہ شہر دیکھنے کے لیے نکلے۔ حضور ﷺ کی پیدائش کی جگہ پر آپ دو مرتبہ گئے۔ مسجد بلال دیکھی، غارِ حرا دیکھنے گئے، پھر انہوں نے عرفات اور منیٰ کا میدان دیکھنے کے لئے کہا وہاں مسجد نمرہ میں گئے وہ سارا وقت انتہائی خوشگوار موڈ میں رہے وہاں سے واپس آ رہے تھے تو انہوں نے فرمایا: ''بھئی موقع اچھا ہے۔ لگے ہاتھ ان تین شیطانوں سے بھی ملاقات کراتے چلو جو یہاں کے مکین ہیں۔'' میں نے گاڑی کا رُخ اُدھر کر لیا وہاں کافی دیر رُکے، تصویریں بنوائیں اور ہمیں اُن تینوں شیطانوں کے بارے میں اُن کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔ اس دوران شام ہو چکی تھی، ہم واپس ہوٹل آ گئے، کھانا کھایا، تھکاوٹ کی وجہ سے سب احباب اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں پرویزؒ صاحب کو اُن کے کمرے تک چھوڑنے گیا تو مجھے اندر بُلا لیا خود بستر پر لیٹ گئے میں سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ میں ہمہ تن گوش رہا۔ مجھے یکدم خیال آیا، میں اٹھا اور ان کے پلنگ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا آپ آج بہت پیدل چلے ہیں، تھک گئے ہوں گے؟ میں آپ کی ٹانگیں دبا دُوں۔ یہ کہنا تھا کہ انہوں نے فوراً ٹانگیں سمیٹ لیں اور اُٹھ کر بیٹھ گئے کہنے لگے نہیں نہیں، میں بالکل تھکا نہیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور پھر بہت دیر تک اپنے اس عظیم استاد کے بارے میں سوچتا رہا جو کسی سے اپنی خدمت کروانے کو بہت ناگوار سمجھتے تھے۔ وہ یقیناً اُن استادوں سے مختلف تھے جو اپنے شاگردوں سے حقے کی چلمیں بھروانا اپنا حق سمجھتے ہیں وہ واقعی ایک عظیم انسان تھے۔

(مطبوعہ طلوع اسلام، اپریل 1989ء)

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ تھا نظامِ مصطفیٰ ﷺ !

عیدِ میلاد النبی 1979ء ﷺ کی تقریبِ سعید پر پرویزؒ صاحب کا خطاب

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے　　نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

عالمِ انسانیت کی جس عظیم ترین ہستی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تقریبِ میلاد منانے کے لئے ہم آج اپنے لئے سرمایۂ سعادت اور توشۂ آخرت حاصل کرنا چاہتے ہیں اُس کے تذکارِ جلیلہ کی عالمگیریت کے متعلق علّامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ اُسے:

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں دیکھ　　بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں دیکھ
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں دیکھ　　اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں دیکھ
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے　　رفعتِ شانِ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ دیکھے

حضور نبی اکرم ﷺ کی شان میں رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ خود ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی باری تعالیٰ نے کہا تھا کہ اے رسول ﷺ! ہم تمہاری رفعتِ شان کے تذکرہ کو انتہائی بلندیوں اور وسعتوں تک پہنچا دیں گے۔ بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں، اپنے تو ایک طرف، غیروں تک نے جن شاندار الفاظ میں ہدیۂ تحسین وتبریک پیش کیا ہے اسے یکجا کیا جائے تو اس سے ضخیم مجلّدات مرتب ہو جائیں۔ لیکن میں، اپنے آج کے خطاب کا آغاز ایک ایسے اعتراف سے کرنا چاہتا ہوں جو تازہ ترین بھی ہے اور عظیم ترین بھی۔ حال ہی میں امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو (غالباً) ابھی تک پاکستان میں نہیں پہنچی۔ کتاب کا نام ہے۔ ''تاریخ کی ایک سو عظیم ترین شخصیتیں'' اور اس کا مؤلف ہے (H.HART) جو افلاکیات اور تاریخ کا عالم ہے۔ اس میں اس نے تاریخِ انسانیت (یعنی کسی خاص قوم، خاص ملک یا خاص زمانہ کی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت کی تاریخ) کی ایسی ایک سو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے معیار کی رُو سے، عظیم ترین اور عدیم النظیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فہرست میں سب سے اوپر (پہلے نمبر پر) کس شخصیت کا نامِ نامی ہے؟ اس ذاتِ گرامی کا جسے خالقِ کائنات نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کہہ کر پکارا اور جس کی شان میں رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ارشاد فرمایا ــــ ہارٹؔ نے کہا ہے کہ میں نے اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کا اسمِ گرامی اس لئے سرِفہرست رکھا ہے کہ:

تاریخِ عالم میں وہ واحد شخصیت ہے جسے مذہب اور دنیاوی امور دونوں میں عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی۔

اس نے لکھا ہے کہ اس فہرست کے مرتب کرنے میں مَیں نے کسی شخصیت کے انفرادی کردار کو معیار نہیں قرار دیا۔ معیار یہ پیش نظر رکھا ہے کہ اس نے پوری تاریخ اور دیگر انسانوں کو کس حد تک متاثر کیا اور اس معیار کی رو سے مجھے محمد (ﷺ) بلند ترین سطح پر فائز نظر آتے ہیں۔ ہارٹؔ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی عدیم النظیر کامیابی کے سلسلہ میں مذہب اور امورِ دنیا کا الگ الگ ذکر اس لئے کیا ہے کہ ان کے ہاں یہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں جن کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں۔ لیکن حضور ﷺ نے، اقدارِ خداوندی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط تھا اور جس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

رسول کی بعثت کا مقصد:

ہمارے ہاں چونکہ اسلام، دین کے بجائے مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے اس لئے رسول کی بعثت کا مقصد وعظ و نصیحت یا نماز روزہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب جو ''نظامِ مصطفیٰ ﷺ'' کی اصطلاح عام ہوئی ہے تو اس میں بھی اس نظام کا کوئی واضح نقشہ سامنے نہیں لایا گیا۔ بات نماز، روزہ یا تعزیرات تک ہی محدود رکھی جاتی ہے۔ ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا تھا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا ہے:

> ''رسولؐ اس لئے آتا ہے (یعنی آتا تھا) کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ (مضرابِ وحی سے) اس کے نفسِ قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (علیہ الرحمۃ) اپنی کتاب تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں:

> چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کر چکی تھی اس لئے اس زمانے میں توحید کی اشاعت اور طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے۔ (1) مگر چونکہ ہمارے نبی اکرمؐ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی اور معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے، اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضور ﷺ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کر دیا۔ (جو ان خرابیوں کا سرچشمہ تھیں۔)
>
> (جلد اوّل، ص:66)

---

(1) ہم شاہ صاحب کے اس خیال سے کلیۃً متفق نہیں۔ دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے اس لئے ہر رسول کی بعثت کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی رسول کے زمانے میں جو خرابی سب سے زیادہ فساد انگیز ہوتی تھی وہ اس کے استیصال کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ قرآنِ کریم شاہد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ملک عظیم (عظیم مملکت) عطا ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ مملکت کے فرائض اور ذمہ داریاں نماز، روزہ تک محدود نہیں ہوتیں اگرچہ یہ بھی اس کے نظام کے اہم ستون ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ کی مکی زندگی:

بعض کوتاہ بینوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب تک حضور ﷺ مکہ میں رہے، اسلام کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھا لیکن جب مدینہ میں مملکت حاصل ہوئی تو سیاسی، معاشرتی، معاشی شعبوں کو مذہب کے دائرہ میں لے آیا گیا۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نبوّت کے آغاز ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر مملکت کا نظام تھا۔ مکی زندگی اس مقصد کے حصول کی تیاری کا زمانہ تھا کیونکہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ الکامل ابن اثیر میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا:

''یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالا دست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے حکومتِ خداوندی کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

مقصدِ رسالت:

اسی ضمن میں تاریخ الکامل ہی میں ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ لکھا ہے:

شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبوی میں حاضر تھے کہ قبیلہ عامرؔ کا ایک معزز اور بزرگ سردار، اپنا عصاء ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضور ﷺ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ: لکل قول حقیقة، وما حقیقة قولك۔ ''ہر دعویٰ کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے۔'' آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور بھائی عیسیٰؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامریؔ نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کر دوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا، جنت کے باغات۔ اس نے کہا یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا:

نعم النصر و التمكين فى البلاد

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔

اس سے واضح ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا جس میں ایسا نظام قائم کیا جا سکے جس کی نظیر کہیں نہ ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔

یہ تو میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اس مختصر سے وقت میں اس نظام کے تمام گوشوں کو آپ کے سامنے لاسکوں۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کے دو ایک اہم پہلوؤں کی خفیف سی جھلک آپ کو دکھا دوں۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظام (یعنی دینِ

خداوندی) کے ماحصل کو ایک شعر میں اس جامعیت سے سمو دیا ہے کہ اس پر غور کرنے سے بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

میں مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ اس نظام نے حاکم ومحکوم کا فرق کس طرح مٹایا اور سائل ومحروم کا وجود کس طرح ختم کیا۔ قبل اس کے کہ میں ان فردوس بداماں مناظر کو آپ کے سامنے پیش کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نظام کا آغاز حضور رسالت مآب ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوا تھا لیکن (اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق) اس کی تکمیل خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد مکہ میں حضرت سہیلؓ بن عمر کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ:

''خدا کی قسم، اسلام کا مقصد تکمیل تک پہنچے گا۔ میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے کہ (آپ نے فرمایا تھا) لوگو! میرے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہو۔ عرب تمہارے تابع فرماں ہوں گے، عجم باجگذار۔ خدا کی قسم، تم قیصر وکسریٰ کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔'' (تاریخ الکامل)

اس دعویٰ کی تکمیل خلفائے راشدینؓ کے ہاتھوں ہوئی تھی، بالخصوص حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں۔ لہٰذا میں جو مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا ان کا تعلق محمد رسول اللہ ﷺ کے عہد سعادتِ مہد ہی سے نہیں، بلکہ (قرآن کے الفاظ میں) والذین معہ، کے زمانے سے بھی ہوگا۔ مَیں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اس نظام کی تکمیل اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق، صدرِ اوّل میں ہوئی تھی۔ یہ اس لئے کہ قرآنِ کریم تو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطہء نظام ہے۔ جن اصول واقدار کے مطابق یہ نظام متشکل ہوگا، وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن اس کی جزئیات اور طرق واسالیب مرورِ زمانہ کے ساتھ عندالضرورت بدلتے جائیں گے۔ لہٰذا جوں جوں انسانی زندگی کے تقاضے وسیع ہوتے جائیں گے، یہ نظام بھی اس کے مطابق وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآنی راہنمائی حدود فراموش ہے، اسی طرح، اس کی روشنی میں قائم کردہ نظام بھی قیود ناآشنا ہے۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ط (13:35) تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ط (14:25)

یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ!

❁❁❁❁

نہ حاکم نہ محکوم:

اب میں اس نظام کے پہلے گوشے کی طرف آتا ہوں۔ یعنی اس امر کی وضاحت کی طرف کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہوگا، نہ محکوم۔ انسانی نظامِ مملکت میں (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جب حکومت قائم ہوگی تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ حاکم اور محکوم کے بغیر تو حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا! لیکن انسانی نظام اور خدائی نظام

میں یہ بنیادی فرق ہے۔ نظامِ خداوندی میں، اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ اس میں اطاعت قوانین کی ہوتی ہے، اور قوانین ایسے جو انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں، بلکہ خود خدا کے نازل فرمودہ ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق، مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا، اور جسے ہم حکومت کہتے ہیں اس کا فریضہ ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔ ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔ اِسے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ان کی فرماں روائی کو بطیبِ خاطر قبول کرلیں ان پر ان کا اطلاق ہوگا۔ انہی کو اُمتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ ان قوانین کی دوسری خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تغیر وتبدل یا حک واضافہ نہیں ہوسکے گا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس نظام میں نہ صرف یہ کہ کوئی حاکم یا محکوم نہیں ہوگا بلکہ افرادِ معاشرہ کو اس کا کلی اطمینان ہوگا کہ جن قوانین کی اطاعت انہوں نے بطیبِ خاطر اختیار کی ہے ان میں کبھی، ردّوبدل نہیں ہوگا۔

فرماں روائی صرف قانون کی:

جہاں تک محکومیت کا تعلق ہے، تاریخ انسانیت اس پر شاہد ہے کہ سیاسی محکومیت کے مقابلہ میں، مذہبی پیشواؤں کی محکومیت زیادہ متشدد اور سخت گیر ہوتی ہے۔ اس نظام میں جہاں سیاسی محکومیت کو ختم کیا گیا وہاں، مذہبی پیشوائیت کے اقتدار ہی کو نہیں، اس کے وجود تک کو معدوم کردیا گیا۔ قرآنِ کریم نے یہود ونصاریٰ کے متعلق کہا ہے کہ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9:31) ''انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔'' اس آیت کی تفسیر میں حضور ﷺ نبی اکرم کا ارشادِ گرامی نہایت واضح اور تابناک ہے:

> حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے دیکھ کر فرمایا۔ ''عدیؓ! اس بت کو گلے سے اتار پھینک۔'' اس وقت آپ سورۂ برأۃ (توبہ) تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی۔ ''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9:31)۔۔۔ تو میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا! مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال کردیتے ہیں اور تم حلال سمجھنے لگتے ہو اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کردیتے ہیں اور تم حرام سمجھنے لگتے ہو۔ میں نے اقرار کیا! بیشک واقعہ یہی ہے تو فرمایا یہی تو انہیں خدا بنالینا ہے۔ (جامع بیان العلم، ابن عبدالبر)
>
> حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنینؓ! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپؓ نے فرمایا: ''کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں''۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ: ''یاد رکھو! تم سے پہلی اُمتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا ___ نتیجہ اس کا یہ کہ

خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔''

(شاہکارِ رسالت، ص:72)

یوں اس نظام نے مذہبی پیشواؤں کے وجود کو ختم کر دیا۔ اس میں قانونِ خداوندی کا نفاذ بھی مملکت کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تشریح و تعبیر کا فریضہ بھی مملکت ہی ادا کرتی تھی۔

اس نظام کی اوّلیں مرکزی اتھارٹی، حضور نبی اکرم ﷺ کو ارشاد تھا کہ: ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48)''۔ ''ان کے معاملات کے فیصلے قرآنِ مجید کے مطابق کرو۔'' حضور ﷺ نے اس کتابِ خداوندی کے مطابق سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ عمر بھر اسی کے مطابق فیصلے فرماتے رہے، اور دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، پوری اُمت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ ــــ کتاب اللہ۔

(صحیح مسلم، باب حجۃ النبی 1/397)

مَیں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے ــــ وہ ہے کتاب اللہ۔

حضور ﷺ کے بعد، آپ کے سچے جانشین اپنے زمانے میں اس مسلک پر قائم رہے کیونکہ یہ ارشادِ خداوندی ان کے سامنے تھا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں اپنے لئے دعا یہ مانگی تھی کہ:

''یا اللہ! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تا کہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔''

اور سامعین سے کہا تھا کہ:

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی اور اس پر عمل کرو تا کہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔

(شاہکارِ رسالت، ص:66)

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ ''میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری بات مانیں۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے آپ اس کے مطابق مشورہ دیں۔'' آپ کے عہد میں عمالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلیں معیار یہ تھا کہ وہ کس حد تک قرآن میں تفقہ کر سکتے ہیں۔ جب مکہ کے گورنر نافع بن عمرؓ بن عبدالحارث نے عبدالرحمانؓ بن ابزی کو وادی کا والی مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے اس (گورنر) سے پوچھا کہ اس

انتخاب کی بنیاد کیا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ وہ شخص قرآن مجید میں تفقہ کرتا ہے اور دین کے فرائض کا علم رکھتا ہے۔ تو آپ بہت خوش ہوئے۔ قرآنِ کریم کی اہمیت وعظمت آپ کے رگ وپے میں اس حد تک سرایت کئے ہوئے تھی کہ جب آپ کو وہ زخم لگا ہے جس سے آپ کی شہادت واقعہ ہوگئی تو کیفیت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آچکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے۔ تو آپ نے ان سے کہا کہ:

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تک تم اسے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لیے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بے قرار ہیں اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ اس باب میں متردد نہ ہوں۔ جہنم کی آگ آپ کو چھو نہ سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس سے کہا کہ بھائی! تمہارا علم اس بارے میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف سے نچھاور کر دیتا۔'' آپ نے یہ الفاظ کہے تو حضرت ابن عباسؓ نے جو آپ کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ ''یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حقوق برابر عطا کرتے تھے۔'' یہ سن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا! ابن عباسؓ! کیا تم میرے بارے میں اس امر کی شہادت دو گے؟ وہ خاموشی سے سنتے رہے تو آپ نے دوبارہ کہا کہ کہو ابن عباسؓ! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا۔ اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے، حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کے الفاظ میں، اس کی عام گواہی دی کہ:

عمرؓ ___ کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم تھے اور دین کے سب سے بڑے فقیہہ۔

میں نے ان حضرات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے تفقہ کا ذکر اس لئے خاص طور پر کیا ہے کہ اسلامی مملکت میں، فقہا اور علماء کا الگ وجود نہیں ہوتا تھا۔ سربراہِ مملکت اور عمالِ حکومت ہی فقہاء اور علماء ہوتے تھے۔ اس دور میں نہ اُمت میں الگ الگ فرقے تھے، نہ ان کی الگ الگ فقہیں ___ ایک اُمت تھی۔ ان کی ایک مرکزی اتھارٹی ___ وہی اتھارٹی قرآنی قوانین نافذ کرتی تھی اور وہی ان قوانین کی فقہی تعبیرات کا حق رکھتی تھی۔ کسی اور کو ان کی تعبیرات اور تشریحات کا حق اور اختیار نہیں تھا، بعینہٖ جس طرح آج مملکت کے قوانین کی تعبیرات کا حق نمائندگانِ حکومت کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ چونکہ مملکت کی بنیاد کتاب اللہ پر تھی اسی لئے کتاب اللہ مملکت کے گوشے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ امام ابنِ حزم کی تحقیق کے مطابق عہدِ فاروقی میں قرآن مجید کے کم وبیش ایک لاکھ نسخے مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔ قرآنی تعلیم کی اس قدر عام اشاعت کا نتیجہ تھا کہ اُمت

قرآنی اور غیر قرآنی امور میں خود امتیاز کر سکتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

حاکم کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔

وحی اور رائے میں فرق:

امورِ مملکت کے فیصلے تو قرآنِ مجید کے اصول، اقدار اور احکام کے مطابق ہوتے تھے جو غیر متبدل تھے لیکن ان کی جزئیات کا تعلق اور ان کے نافذ کرنے کا پروگرام باہمی مشاورت سے طے پاتا تھا۔ اس مشاورت میں بھی اصول یہی کارفرما ہوتا تھا کہ یہ مشورے حدود اللہ کے مطابق ہوں۔ جب عراق کی زمینوں کے متعلق اہم سوال زیرِ بحث آیا (جس کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) تو حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو تقریر فرمائی ___ اس میں کہا:

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی اور بعض نے مدافعت، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتابِ خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس باب میں آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ ''اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے۔'' آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور کہا کہ ''تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے۔'' اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: ''یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت نہ بناؤ۔'' عمرؓ کی رائے ہی نہیں۔ کسی ایک اسلامی مملکت کے وضع کردہ قوانین بھی ابدی نہیں ہوتے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بعد میں آنے والی اسلامی مملکت تبدیلی کر سکتی ہے۔ اس اہم اصول کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کی رُو سے آپ نے فرمایا:

بیشک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا ہے بنیادی طور پر اس کا تعلق قانون سازی کے اصول سے ہے لیکن بغور دیکھئے تو اس میں وہ عمیق نکتہ بھی پوشیدہ ہے جو دین کی بنیاد ہے یعنی اس میں ساری اہمیت اصولوں کو حاصل ہوتی ہے۔ شخصیتوں کو نہیں۔ قرآن تو آیا

ہی شخصیت پرستی کو مٹانے کے لئے تھا۔

❁❁❁❁

شخصیت پرستی:

''شخصیت پرستی'' سے میری نگاہ بلا ساختہ اس عظیم واقعہ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے جس کی مثال دنیائے مذاہب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی، شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہے، خواہ یہ شخصیت پرستی، دنیاوی حکمرانوں کو ''ظل اللہ علی الارض'' (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو، اور خواہ روحانی پیشواؤں کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیت پرستی کی دوسری شکل، پہلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ دنیاوی حکمرانوں کی محکومیت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقید کرسکتی ہیں لیکن روحانی پیشوائیت کی محکومیت کا تسلط انسان کے قلب و دماغ اور روح پر ہوتا ہے۔ اگر کسی (زندہ یا مردہ) ''حضرت صاحب'' کی شان کے خلاف خیال تک بھی ان کے کسی معتقد کے دل میں گذر جائے تو وہ ڈرتا ہے۔ کانپتا ہے۔ لرزتا ہے کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لئے وہ ان کے حضور (اگر وہ زندہ ہوں تو ان کی بارگاہ میں اور وفات پا چکے ہوں تو ان کے مزار کی پائنتی کی طرف سجدہ ریز ہوکر) روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے، معاف کردیجئے، ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا۔ دین اور دنیا میں کہیں کا نہیں رہوں گا ــــ سوچئے کہ کیا شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے فروتر کوئی اور صورت بھی ہوسکتی ہے؟ لیکن شخصیت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآنِ کریم جو انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا، اس نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی! خود حضور ﷺ رسالتمآب کا (زبانِ وحی کی رو سے) یہ ارشاد کہ: انا بشر مثلکم (میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں) شخصیت پرستی کی جڑ پر تبر کی ضربِ کاری کے لئے تھا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اس کی جو مثالیں پیش کیں انہیں آپ سیرتِ طیبہ پر میری پیش کش، معراجِ انسانیت، میں دیکھئے۔ لیکن میں اس وقت اس باب میں حضور ﷺ کی سیرتِ اقدس کی کوئی مثال پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے اپنی تعلیم و تربیت سے اپنے متبعین میں جو قلبِ ماہیئت پیدا کردی تھی، اس سے ان حضرات کی کیفیت کیا ہوگئی تھی۔ (جیسا کہ قرآنِ کریم سے واضح ہے) نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے وقت، ایک درخت کے نیچے صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے خصوصیت سے نماز ادا کرتے ہیں۔

طبعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی گویا طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ بیعتِ رضوانؓ کا درخت ایک فردوس بداماں واقعہ کی یاد تازہ کراتا تھا اور صحابہؓ اس کی پرستش نہیں کرتے تھے، محض اس کے نیچے نماز ادا کرتے تھے۔ نظر بظاہر اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن اس دست پروردۂ نبوت کی نگاہِ حقیقت شناس اس معصوم سی ابتداء سے آنے والے خطرات کو بھانپ رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر اس درخت کی عقیدت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو رہی ہے جو آگے چل کر خطرناک

شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ علاج تو اس کا یہی تھا لیکن ایسا کرنے کے لئے، اور تو اور، خود اپنے جذبات کا بھی جس جرأت سے مقابلہ کرنا تھا وہ ظاہر ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر دین کا تقاضا جذبات پر غالب نہ آجاتا تو عمرؓ ابن خطاب، فاروقِ اعظمؓ کس طرح بن جاتا۔ چنانچہ آپ نے پوری ہمت اور جرأت سے فیصلہ کیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کٹ گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ:

انما هلك من قبلكم بهٰذا يتبعون اٰثار انبياءهم فاغذوها كنائس وبيعا۔

تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوگئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے محسوس آثار کا اتباع شروع کردیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنالیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

اراء كم ايها الناس رجعتم الى العزىٰ۔

تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس سے تم بت پرستی کی طرف لوٹ رہے ہو؟

❁❁❁❁

کیسی دُوررس نگاہ تھی اس متعلّم درس گاہِ نبویؐ کی؟ آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا، لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ اُمت اس خطرہ کے بیجوں کی جھولیاں بھر بھر کر لے جائے گی اور انہیں ساری دنیا میں بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سوسو پرستش گاہیں وجود میں آجائیں۔ جہاں اس توحید کی مدعی اُمت کے سر اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے۔ بہرحال، عمر فاروقؓ ان بعد میں آنے والوں کے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ انہوں نے آثارِ شرک کی جڑ کاٹ کر اُمت کے لئے ایک نظیر قائم کردی تھی۔ لیکن جب اُمت نے قرآن ہی کو چھوڑ دیا تو اس قسم کے نظائر ان کے لئے کس طرح عبرت آموز ہوسکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں دو ایک اور واقعات بھی عبرت آموز ہیں۔

ایک دفعہ آپ حج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں دیکھا کہ ایک مسجد ہے جس کی طرف لوگ دوڑ دوڑ کر جارہے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اس مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ لوگ تبرکاً اس میں جاکر نماز پڑھتے ہیں۔ آپ نے یہ سنا تو لوگوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جس شخص کو اس مسجد کے قریب نماز کا وقت آجائے وہ تو اس میں جاکر نماز پڑھ لے۔ لیکن بہ تکلف اس میں کوئی نماز نہ پڑھے۔

آپ نے ایک دفعہ سنا کہ ایک قبر ہے جسے لوگ حضرت دانیالؑ کی قبر سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ اس قبر کو چھپا دیا جائے۔

میں ان واقعات کے بعد اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر زاہدہ درانی، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دولت کی پیدا کردہ بیماریاں

غریبی اپنے ساتھ جو مصیبتیں لاتی ہے اس کا اندازہ ہر قلبِ حساس بآسانی کرسکتا ہے۔لیکن ایک غلط معاشرہ میں دولت کی فراوانی جس قسم کی تباہیاں لاتی ہے، اس کا تصور عام طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ان تباہیوں کا ایک گوشہ وہ ہے جس کا اندازہ مجھے بہ حیثیت ایک لیڈی ڈاکٹر کے ہوا۔اور انہی کی ایک خفیف سی جھلک میں اس وقت آپ کو دکھانا چاہتی ہوں۔ جہاں تک بیماری اور اس کے علاج کا تعلق ہے۔غریبی کی پیدا کردہ مصیبت ایک ہی نوعیت کی ہوتی ہے۔مثلاً یہ کہ ایک غریب بیوہ اپنی اکلوتی بیٹی کو لے کر آتی ہے جو ایک خطرناک اور مہلک بیماری کا شکار ہے۔میں اسے دوائی لکھ کر دیتی ہوں میں کوشش کرتی ہوں کہ حتیٰ الامکان دوائی سستی ہو۔ وہ نسخہ ہاتھ میں لیکر پوچھتی ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ یہ دوائی بازار سے کتنی قیمت میں ملے گی؟ میں کہتی ہوں، بیس روپے میں مل جائے گی۔ ''بیس روپے'' سُن کر اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ۔اس کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ اور اس کی آنکھوں کی نمی، اس کے دل کی ساری کہانی اس کے ماتھے پر لکھ دیتی ہے۔اور جب یہ دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم آلود ہوجاتی ہیں، تو اُس کے ضبط کئے ہوئے آنسو، ٹپ ٹپ گرنے لگ جاتے ہیں اور اس کے بعد، وہ دِل کی ساری بات زبان پر لے آتی ہے۔

لیکن دولت کی فراوانی ___ یعنی ایک غلط معاشرہ میں دولت کی فراوانی جس قسم کے امراض پیدا کرتی ہے، اس کی نوعیتیں بھی بے شمار ہیں اور ان کی تہہ تک پہنچنا بھی آسان نہیں ہوتا۔مثلاً بالکل نئے ماڈل کی ایک بڑی سی کار کلینک کے دروازے پر آکر رکتی ہے اور بڑے قیمتی لباس میں ملبوس ایک خاتون اس میں سے نکل کر اندر آجاتی ہے۔اس پر عجیب قسم کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہوتی ہے آتے ہی کہتی ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ! مجھے سخت تکلیف ہے۔اس لئے پہلے مجھے دیکھ لیجئے۔لیکن میرے مرض کی تفصیل بہت لمبی ہے۔اس کے لئے آپ کو کافی وقت دینا ہوگا۔اس کے بعد شکایات کی تفصیل کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب! صبح اٹھتی ہوں تو سارا جسم چُور چور ہوتا ہے۔آنکھ کھل جاتی ہے لیکن بستر سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ بصد مشکل اٹھتی ہوں تو چکر آجاتا ہے، پھر بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھے بلڈ پریشر ہے ناں! دو قدم چلتی ہوں تو دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ ملازم ناشتے کے لئے آوازوں پر آوازیں دیتا ہے لیکن مجھے کوئی طلب نہیں ہوتی۔کل ایک انڈہ کھالیا تھا، سارا دِن انتڑیوں میں درد رہا مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ میں زیادہ دن جی نہیں سکوں گی۔لیکن میں سوچتی ہوں کہ پھر میری بچی کا کیا ہوگا۔ نہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں اپنی بچی کو نہیں چھوڑ سکتی۔کوئی اسے مجھ سے چھین کر نہیں لے جاسکتا۔ مجھے ___ ڈاکٹر صاحبہ بھوک بالکل

نہیں لگتی۔ ہر وقت بخار رہتا ہے۔ چھ برس ہو گئے علاج کرتے، کہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فلاں ڈاکٹر سے علاج کیا اور فلاں سے کیا (اس کے بعد وہ شہر کے تمام بڑے بڑے ڈاکٹروں کے نام گنا دیں گی) کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مجھ سے کہتے تھے تمہیں کوئی بیماری ہی نہیں۔ پاگل کہیں گے! کوئی کہتا تھا آپ کے اعصاب کمزور ہیں۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحبہ! بھلا میرے اعصاب بھی کمزور ہو سکتے ہیں؟ بس ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک ہی تکلیف ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ آدھی رات تک جاگتی رہتی ہوں، اور سوچتی رہتی ہوں۔ معلوم نہیں کیا سوچتی رہتی ہوں۔ تنگ آ جاتی ہوں تو خواب آور گولی کھا لیتی ہوں۔ بس یہ ایک دوائی ہے جو مجھے راس آئی ہے اور کسی دوائی سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

میں معائنہ شروع کر دیتی ہوں، اور ہزار کہوں ذرا خاموش رہئے، لیکن وہ اپنی کہانی بدستور جاری رکھتی ہیں۔ معائنہ کے بعد میں دیکھتی ہوں کہ جتنی شکایتیں انہوں نے بتائی ہیں، ان میں سے انہیں کوئی شکایت نہیں۔ ذرا سی اعصابی کمزوری ہے۔ اس کے لئے میں دوائی تجویز کرتی ہوں تو سوال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! یہ دوائی کتنے کی آئے گی؟

آپ کو یاد ہے کہ یہی سوال اس غریب بڑھیا نے بھی کیا تھا! مَیں کہتی ہوں کہ یہی کوئی بیس تیس روپے کی آ جائے گی۔

بیس تیس روپے کی؟ ڈاکٹر صاحبہ! اس دوائی سے بھلا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں نے پانچ پانچ سو روپے فی شیشی والی دوائیاں بھی کھائی ہیں۔ آپ مہربانی کر کے کوئی کام کی دوائی لکھ کر دیجئے۔ کام کی دوائی سے مراد ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ قیمتی دوائی۔

آپ انہیں کوئی دوائی لکھ کر دیجئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کھائیں گے۔ پھر یا تو کسی اور قیمتی دوائی کا مطالبہ کریں گی یا کسی اور ڈاکٹر کی طرف چلی جائیں گی۔ ان کے گھر جائیے تو الماریاں، ہسپتال دکھائی دیں گی۔ سب دوائیوں سے بھری ہوئی۔ کسی شیشی میں سے دو گولیاں کھائی ہوئی کسی میں سے چار۔ ان کی یہ کیفیت عمر بھر رہتی ہے۔ اگر ڈاکٹر کی نگاہ ذرا بھی سائیکالوجی پر ہے تو وہ دو چار نشستوں میں اندازہ لگا لے گی کہ مرض کا سرچشمہ کہاں ہے ــــــ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص مریضہ کی کیفیت نہیں۔ وہ ہمارے اوپر کے طبقہ کا عمومی نقشہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں ایسی خواتین بھی ہوتی ہیں جنہیں سچ مچ کوئی شکایت ہوتی ہے لیکن بیشتر ایسی ہوتی ہیں جنہیں طبعی شکایت کوئی نہیں ہوتی۔ ان کا مرض نفسیاتی ہوتا ہے اور پیدا کردہ ہوتا ہے ہمارے غلط معاشرے کا۔ ان کا جسم بیمار نہیں ہوتا۔ دل بیمار ہوتا ہے وہ دل نہیں جس کی دھڑکن اسٹیتھو سکوپ سے سنی جاتی ہے۔ بلکہ وہ دل جو انسانی خیالات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس دل کی بیماری میں ان کا اپنا قصور زیادہ نہیں ہوتا۔ جب ساری فضا نفسیاتی امراض پیدا کرنے والے جراثیم سے بھرپور ہو تو افراد کے لئے ان سے بچنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین نہیں ہوتا۔ جن کھلونوں کو مقصودِ زندگی سمجھا جاتا ہے، ان سے چند دنوں کے بعد طبیعت بھر جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنے کے لئے یہ لوگ ہر طرف مارے مارے پھرتے ہیں، لیکن چونکہ اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کونسی چیز کھو گئی ہے جسے پُر کرنے کے لیے یہ لوگ ہر طرف مارے مارے پھرتے ہیں، لیکن چونکہ اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کونسی چیز کھو گئی ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں، اس لئے وہ شے انہیں ملتی ہی نہیں

جس سے اُن کی زندگی کا خلا پُر ہو سکے۔ یہ ہے وہ ناکام جستجو جس سے یہ اس قسم کے نفسیاتی اوہام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں انسانی زندگی کا مقصد سمجھایا جائے اور ان کے سامنے وہ نصب العین حیات رکھ دیا جائے جس کے حصول کی کوشش میں انسانی قلب کو سچی راحت ملتی ہے۔ سائیکوتھراپی کے مشہور ماہر ڈاکٹر ینگ نے کہا تھا:

''میں نے اپنی زندگی کے نصفِ آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ کیا ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس شئے کو ضائع کر دیا تھا جو ''زندہ مذہب'' انسان کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی شے دے دی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی۔''

یہ شے قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو کر میرے سامنے آئی ہے کہ خدا کا یہ ابدی نسخہ کس طرح ''رَبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ'' یعنی دل کی بیماریوں کا علاج ہے یہی وہ نسخہ ہے جس پر آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حجاز کے ہسپتال میں عمل کیا گیا تھا اور جس سے انسانیت کے سب روگ دُور ہو گئے تھے۔ اسی نسخہ سے آج ہمارے معاشرہ کی بیماریوں کا بھی علاج ہو سکتا ہے۔

(مطبوعہ طلوع اسلام، ستمبر 1990ء)

تبصرہ کتاب متنوعات

محترم آفتاب عروج 1929ء کو ہوشیار پور، انڈیا میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کرنے کے بعد 1947ء میں آرمی جوائن کی۔ بعد ازاں ٹیکسٹائل کے شعبہ میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران یونین کی سرگرمیوں میں بھی فعال رہے۔ 1972ء میں روزگار کے سلسلہ میں چنیوٹ میں آ گئے اور ہمیشہ کے لیے خاکِ چنیوٹ پابستہ ہو کر رہ گئے۔

تجسس اور مطالعہ کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ جو انہیں بتدریج کشاں کشاں زعما دانش قرآنی کی خدمت عالیہ میں لے گیا تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذوق فکرِ قرآنی کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ ہمیشہ سینے میں تڑپ رہی کہ پاکستان میں قرآن خالص کی حکومت قائم ہو، تاکہ اقوام عالم کے لئے قرآنی معاشرت کا ایک نمونہ پیش کیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں روزنامہ جنگ، خبریں، نوائے وقت اور ماہنامہ الشریعہ، البرہان اور طلوعِ اسلام میں تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ ان کے موضوعات ہمیشہ قرآنیات، پاکستانیات، تاریخ، رسوم و مذاہب رہے۔ کتاب زیر نظر انہیں مضامین کا مجموعہ ہے جو کہ پون صدی کے غور و فکر کا نچوڑ ہے۔ صفحات 344 تقریباً، قیمت 500 روپے۔

ملنے کا پتہ: House No. 11/9-W, Goojar Road, Goojar Chowk, Satellite Town, PC-35400, Chiniot, Cell: 0345-7961795

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 42 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(42) بیالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ بیالیس (42) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو مشرف قبولیت بخش دے اور کوئی صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام خطرے میں ہے

بیس کنال رقبہ میں تعمیر شدہ ایک وسیع وعریض، عالیشان بنگلہ کے نوکر گھروں کے ایک تنگ وتاریک کمرہ میں، سردیوں کی ایک کپکپاتی رات، ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ سخت جاڑا لیکن کمرے میں آگ تک روشن نہیں۔ گرم کپڑے ماں کے پاس نہیں تو بچے کے لئے کہاں سے آتے۔ ماں اسے چیتھڑوں میں لپیٹ کر چھاتی کے ساتھ لگا لیتی ہے کہ اسے کچھ حرارت پہنچے۔ وہ بھوک سے روتا ہے لیکن مسلسل فاقوں سے، ماں بچاری کے دودھ کے چشمے سوکھ چکے ہیں۔ بمشکل دو چار گھونٹ دودھ بچے کو مل سکا۔ وہ بلک رہا ہے۔ غمزدہ ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ باپ ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے کہ پہلے ہی گزارا مشکل تھا اب اس مزید ذمہ داری کا بوجھ کیسے اٹھایا جا سکے گا۔

اُسی آن، سامنے بنگلہ کے ایک برق پاش کمرہ سے بھی ایک نومولود کے رونے کی پہلی آواز سنائی دیتی ہے ایک چھوڑ، دو دو لیڈی ڈاکٹرز زچہ کے سرہانے، کئی نرسیں، کمرہ میں ہر قسم کا سامان، اعلیٰ درجہ کے نرم اور گرم کپڑے۔ دودھ پلانے کو انائیں۔ اور بطور حفظ ماتقدم ولایتی دودھ کے ڈبے۔ وٹامنز کی شیشیاں اس پر مستزاد۔ چاروں طرف سے، مبارکبادیاں، شہنائیوں، مٹھائیوں کی چہل پہل ہے۔ مولوی صاحب بچے کے کان میں اذان دینے کے لئے تشریف لائے تو ایک سو ایک روپیہ نذرانہ پیش کیا گیا۔ عقیقہ ہوا تو کتنے بکرے ذبح کئے گئے۔ ختنہ کی تقریب پر شہر بھر کے امراء کی دعوت ہوئی۔

اس دوران، نوکر گھر کے تنگ وتاریک کمرے میں پیدا ہونے والا بچہ، بدستور کپڑوں کے لئے ترستا اور دودھ کے لئے بلکتا رہا۔

کیا کسی بڑے سے بڑے دانشمند کی منطق بتا سکتی ہے کہ اس غریب (مالی) کے بچے نے کیا جُرم کیا تھا جس کی اُسے یہ سزا مل رہی ہے، اور اُن خان صاحب کے صاحبزادے نے کون سا تیر مارا تھا جس کے صلہ میں اسے یہ تمام آسائشیں میسر ہیں؟ برہمن نے اس کی یہ (ابلہ فریب) توجیہہ وضع کر لی کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کا نتیجہ ہے ــــ اس توجیہہ کی بنیاد غلط سہی، لیکن اس سے (کم از کم) منطقی نتیجہ تو مرتب ہو جاتا ہے یہ سب خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس نے جسے جیسا چاہا بنا دیا اور جس حالت میں چاہا رکھا۔ اس میں کسی کے لئے دم مارنے کی جا نہیں۔

وہ، یہ جواب دے کر مطمئن ہو گئے لیکن انہوں نے کبھی سوچا بھی کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوا؟ لیکن انہیں اس سے کیا غرض! لیکن ان کے اس جواب سے، خدا کا جس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے جو شخص اسے زبان پر لانے کی جرأت (یا حماقت) کر بیٹھے، اس کے لئے احتساب کا ڈنڈا اور فتویٰ کا کوڑا موجود ہوتا ہے۔

پہلے تنہا مالی کام کرتا تھا۔ اب اس کی بیوی نے بھی محنت مزدوری شروع کر دی تا کہ کسی طرح روٹی کا دھندا چل سکے۔ اس دوران میں، بچہ رینگتے گھسٹتے چار پانچ سال کا ہو گیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح، اپنا پیٹ کاٹ کر بچے کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ صبح، پھٹے ہوئے (پیوند لگے) کپڑوں میں ملبوس بھوکا اسکول جاتا۔ وہاں اپنے ماں باپ کی مفلسی اور ناداری کے جرم کی پاداش میں، اپنے ہم مکتبوں کے حقارت آمیز طعنوں کا شکار، اور ماسٹر صاحب کے ڈنڈے کا ہدف بنتا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ جماعت میں اوّل یا دوم آتا رہا۔

اُدھر خان صاحب کا صاحبزادہ چیفس کالج میں داخل ہوا۔ نوکر چاکر حلقہ بند، سواری کے لئے باہر موٹر، کالج میں گھوڑا، زرق برق پوشاک، اعلیٰ درجے کے کھانے، رہنے سہنے کی ہر قسم کی آسائش نہ کسی چیز کی کمی، نہ کسی بات کی محتاجی۔ اس نے پانچ سات برس انہی عیش سامانیوں میں گزارے۔ عمر بڑھی تو مشاغل کی نوعیت میں فرق آ گیا۔ ان کے لئے کالج کی فضا سازگار (یا کافی) نہیں تھی۔ کالج چھوڑ ولایت چلا گیا۔

مسلسل محنت، خوراک کی کمی، آرام کا فقدان، پریشانیوں کی بھرمار، مالی دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا اور اس کے بعد بیمار پڑ گیا۔ گھر کھانے کے لئے نہیں تھا۔ علاج کے لئے پیسہ کہاں سے آئے وہ مختلف ہسپتالوں کے برآمدوں میں ایڑیاں رگڑتا رہا کہ کہیں داخلہ مل جائے۔ لیکن پیسے کے بغیر داخلہ کیا مل سکے۔ بالآخر ایک دن ہسپتال کے برآمدے میں جان توڑ دی ___ ایک نامراد بیوہ، دو یتیم لڑکیاں اور ایک معصوم لڑکا (جو اُس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا) ''ورثہ'' میں چھوڑے ___ گھر میں دو چار برتن تھے۔ انہیں بیچ کر تجہیز و تکفین اور درود فاتحہ کا انتظام کیا۔ لوگ مُردے کو دفن، اور اس کی عاقبت بخیر ہونے کی دعا کر کے، اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اور بیس لاکھ کی آبادی میں سے کسی نے اتنا نہ پوچھا کہ اب اس بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی زندگی کیسے گزرے گی! بڑی مشکل سے خان صاحب نے اتنا کرم کیا کہ انہیں کچھ دنوں تک کے لئے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اب مالی کے لڑکے کو، ماں کے ساتھ مل کر محنت مزدوری بھی کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے پڑھائی جاری رکھی۔

دو ایک ماہ گزرے تھے کہ ایک رات، اچانک خان صاحب کا انتقال ہو گیا۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں زہر دے دیا گیا تھا)۔ پانچ لاکھ کی انشورنس پالیسی، کئی مربعے اراضی، متعدد کوٹھیاں، دوملیں، نقدی، زیورات، موٹریں ترکہ میں چھوڑیں۔ صبح کو صاحبزادہ صاحب ان سب کے مالک تھے ___ اَن پڑھ، اوباش عیاش جس میں ایک پیسہ کمانے کی صلاحیت نہیں، اس کا شمار ملک کے بیس دولتمند خاندانوں میں ہو گیا ___ سرکار دربار میں ہر طرح کی عزت، حاکم، افسر ہر شام اس کی کوٹھی پر۔ دور دور تک شہرت، دو چار غنڈوں کے پشتیبان بنے۔ ایک دو سیاسی لیڈروں کے دوروں کے اخراجات کا ذمہ لیا۔ پھر ڈر کا ہے کا؟ جسے چاہا لٹوا دیا جسے چاہا پٹوا دیا۔ اُس کی لڑکی نکلوا دی۔ اس کی بہن اغواء کرا دی۔ قانون کے ہاتھ کو رشوت نے مفلوج کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ اس کی گرفت سے مامون تھے۔ باقی رہی معاشرہ کی انگشت نمائی۔ سو اس کے لئے ہر جمعرات کی شام داتا دربار کی حاضری۔ محلہ کی مسجد کے امام صاحب کی تنخواہ، مسجد میں قالین، پنکھے، برف، آئے دن نذر نیاز کی دیگیں۔

اولیاء کرامؒ کے عرس، پیشہ ور گداگروں کے لئے صدقہ خیرات۔ کاروباری یتیم خانوں کے لئے چندہ ___ اور پھر لندن سے واپسی پر سر راہے حج اور عمرہ اس کے بعد جوان کے خلاف انگلی اٹھائے، یہ پورا لشکر اس کی آنکھ نکالنے کے لئے تیار ہو جائے۔

❁❁❁

مالی کے لڑکے نے، دو سال کی کوہکنی کے بعد میٹرک کر لیا۔ ویسے تو فرسٹ ڈویژن مل گئی۔ لیکن کالج میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نوکری کی تلاش شروع ہوتی۔ لیکن جس کے پاس نہ رشوت کے لئے پیسہ، نہ سفارش کے لئے رسائی ہو، اسے نوکری کہاں سے مل جائے ___ ایک ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک ایک آستاں پر ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن دھکوں کے سوا کہیں سے کچھ نہ ملا۔ چھ ماہ کی بھٹک پیمائیوں کے بعد، ایک دفتر میں چپراسی کی جگہ ملی۔ جگہ چپراسی کی لیکن کام، صاحب کی موٹر صاف کرنے کا، ضعیف اور بیمار ماں، دو بہنیں جن کی عمر اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ ان کی ذمہ داری اور ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ___ ہر مہینہ کی یکم کو جب اس کی ہتھیلی پر ساٹھ روپے رکھ دیئے جاتے، تو دفتر والے مطمئن ہو جاتے کہ انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا ہے۔ جو کچھ اس کا واجب تھا اسے ادا کر دیا گیا ہے ___ یہ دیکھنا کسی کی ذمہ داری نہیں تھی کہ اس ساٹھ روپے میں، ان چار نفوس کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو سوکھی روٹی بھی میسر آ سکتی ہے یا نہیں! یہ دیکھنا کسی کی ذمہ داری نہیں تھی۔

یہ لڑکا بچپن سے نماز روزے کا پابند تھا۔ جمعہ کے خطبہ میں خطیب عام طور پر دہراتا کہ خدا کی ایک صفت رزاق بھی ہے۔ وہ جسے پیدا کرتا ہے اس کے رزق کی ذمہ داری بھی لیتا ہے ___ وہ یہ سُنتا تو جی ہی جی میں سوچتا کہ اگر یہ سچ ہے کہ اپنی مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر لے رکھی ہے، تو ہم بھوکے کیوں مر رہے ہیں! ہمارے معاملہ میں خدا کی یہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ کیا ہم اس خدا کی مخلوق نہیں جو اپنی مخلوق کے رزق کا ضامن ہے؟ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ سوالات اٹھتے لیکن اسے ان کا کوئی جواب نہ ملتا۔ وہ مولوی صاحب سے پوچھتا تو وہ اسے خشمگیں آنکھوں سے گھور کر دیکھتے اور یہ کہہ کر چُپ کرا دیتے کہ اس قسم کے سوال کرنا اللہ رب العالمین کی شان میں گستاخی ہے۔ وہ آقا ہے ہم اس کے غلام ہیں۔ وہ مالک ہے ہم اس کے بندے ہیں۔ وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ بندوں اور غلاموں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ آقا اور مالک سے اس قسم کے سوال کریں۔ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ یہ دنیا لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کتے۔ یہاں کے دولتمندوں کے لئے یہ چند روزہ مال و متاع ہے۔ عاقبت کا گھر غریبوں اور محتاجوں کے لئے ہے ___ مولوی صاحب ان مواعظِ حسنہ کے بعد خوش ہو جاتے کہ ہم نے ''مسئلہ سمجھا کر'' اسے خاموش کر دیا ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے سینے کی یہ آتشِ خاموش، اندر ہی اندر، کس کس چیز کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنائے چلی جا رہی ہے، اور آخر الامر، یہ ایک دن کیسا شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھنے والی تھی۔ لیکن مولوی صاحب کو یہ کچھ سوچنے کی نہ ضرورت تھی، نہ فرصت انہیں تو بلا محنت کئے سب کچھ ملتا تھا۔

❁❁❁

اس لڑکے کی ماں کا والد فوت ہو گیا تو ترکہ میں ایک مختصر سا مکان چھوڑ گیا جو اس کے حصہ میں آیا۔ وہ خوش تھی کہ اب کچھ آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور عند الضرورت اسے فروخت کر کے، جوان لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر سکوں گی۔ لیکن مکان میں جو کرایہ دار بستا تھا اس نے اُسے کرایہ دینے سے انکار کر دیا۔ غریبوں اور بے کسوں کا یہ خاندان حیران تھا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ مکان کا کرایہ کیوں نہیں دیتا تھا؟ انہوں نے اِدھر اُدھر لوگوں سے ہمدردی کا واسطہ دے کر، اسے کہلوایا کہ وہ یا کرایہ ادا کرے، یا مکان چھوڑ دے لیکن وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا ___ اور لوگ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئے کہ اس غنڈہ سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں مول لیں! اب اس بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے ___ ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ اس نے (خدا واسطے کام کرنے کا وعدہ کر کے) سو روپے کا ابتدائی خرچ بتا دیا۔ اس نے کہیں سے قرض اٹھا کر سو روپے دے دیئے ___ دیوانی عدالت کا مقدمہ۔ تین سال ہونے کو آئے۔ ابھی پہلی پیشی سے بات آگے نہیں بڑھی ___ اب نہ اس بچاری کی بات وکیل سنتا ہے، نہ وکیل کی شنوائی جج صاحب کی عدالت میں ہوتی ہے ___ جب تک اہلمدوں اور ناظروں کو راضی نہ کیا جائے، باب عالی تک رسائی اور شنوائی کیسے ہو؟ ایک دفعہ کوئی نیک دل، خدا ترس تحصیلدار آ گیا۔ وکیل صاحب نے کسی طرح بات ان تک پہنچائی تو اسے اس بیچاری کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ اس نے اس غاصب سے مکان خالی کرانے کا کچھ بندوبست کیا۔ اُس بدمعاش نے اس کے خلاف دو چار جھوٹی درخواستیں دلوا دیں۔ مکان تو کیا خالی ہونا تھا، اُلٹا اسی بیچارے کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی ___ فرائض شناس، دیانتدار، شریف النفس، خدا ترس، منصف مزاج افسر ہمیشہ اپنے ہم عصروں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ اور وہ اس موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس خارِ پہلو کو نکال باہر کیا جائے۔ لہٰذا اس قسم کی شکایتوں کو سچا ثابت کرنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں تا کہ اسے اپنے دیانتدار ہونے کی سزا ملے اور اسی قسم کے دوسرے دیانتدار اس سے عبرت پکڑیں۔ غنیمت ہے کہ تحصیلدار صاحب سستے چھوٹ گئے اور بات تبدیلی سے آگے نہ بڑھی۔ وہ تبدیل ہو گئے اور اس غاصب کا قبضہ مخالفانہ برحق ہو گیا۔

اب وہ کرایہ دار صاحب، مکان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں، اور مکان کے مالک بیٹھے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ وہ بڑھیا بچاری اب اس فکر میں ہے کہ کہیں سے پانچ روپے مل جائیں تو وہ جناتی بابا سے تعویذ لائے جس سے (اس کی پڑوسن کے کہنے کے مطابق) وہ بدمعاش کرایہ دار بھسم ہو جائے گا۔

❁❁❁

لڑکیاں جوان ہو کر (یوں کہئے کہ) بوڑھی ہو رہی تھیں اور ان کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آتا تھا۔ ان کی جھگی کے قریب ایک نوجوان لڑکا رہتا تھا ___ کسی مل میں مستری ___ اس نے اپنی شرافت کا سکہ جما کر ان کے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بڑی لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ اچھی ملازمت کے بہانے کسی دوسرے شہر چلا گیا اور بیوی کو بھی

ساتھ لے گیا۔ ایک عرصہ تک ان کی طرف سے خیر خیریت تک کی اطلاع نہ آئی۔ یہ بیچارے بہت پریشان تھے۔ جس شہر کا وہ کہہ کر گیا تھا، وہاں اس کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ ایک دن ایک عورت آئی اور اُس لڑکی کا یہ خفیہ پیغام لائی کہ میرا خاوند بُری عادتوں کا شکار ہو گیا ہے۔ مجھے اس نے قید کر رکھا ہے اور بات بات پر میری ہڈیاں توڑتا ہے۔ مجھے کسی طرح اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ چپراسی بیچارہ مصیبتوں کا مارا، وہاں گیا۔ لمبے چوڑے جھگڑے کے بعد، وہ درندہ پانچ سو روپیہ لے کر طلاق دینے پر راضی ہوا۔ اس غریب نے مرتے بھرتے کسی طرح روپے کا انتظام کیا اور مظلوم بہن کو گھر لے آیا۔ وہ کب تک بھائی کے سر پر بوجھ بنے بیٹھی رہتی۔ لیکن غریب مطلقہ سے نکاح بھی کون کرتا___ اس دوران میں اس کا وہی پہلا خاوند پھر کہیں سے آ گیا___ منت سماجت شروع کی۔ محلے کے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔ وہ پانچ سو روپیہ واپس دینے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ اس مطلقہ نے اُسے غنیمت سمجھا اور اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کے لئے رضامند ہو گئی۔ لیکن مولوی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ چونکہ اسے ''تین طلاق'' مل چکی ہے اس لئے یہ اپنے سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کر سکتی جب تک اس کا پہلے کسی سے حلالہ نہ ہو جائے۔ پوچھا گیا کہ حلالہ کیا ہوتا ہے تو انہوں نے بتایا کہ کسی اور شخص سے ایک رات کے لئے نکاح اور دوسری صبح طلاق___ پہلے تو اس کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ ہوا لیکن جب ان سے کہا گیا کہ معاملہ ''شریعت'' کا ہے اور اس کے بغیر ان کا باہمی نکاح ہو نہیں سکتا تو وہ بیچاری سینے پر پتھر رکھ کر اس کے لئے آمادہ ہو گئی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ حلالہ ہو کس سے؟ اس کے لئے مولوی صاحب نے کہا کہ چلئے! میں ہی اس کارِ خیر میں آپ لوگوں کی مدد کئے دیتا ہوں بشرطیکہ مجھے سو روپے ساتھ دیا جائے۔ انہوں نے یہ زہر کا پیالہ بھی پی لیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بیوی سے رضامندی کا کاغذ لکھوایا اور ''قانون و شریعت'' کے مطابق، اس مطلقہ سے نکاح کر لیا___ نکاح کیا تھا ایک رات کے لئے لیکن مولوی صاحب کی نیت بدل گئی۔ اب وہ طلاق دینے کے لئے ایک ہزار روپیہ طلب فرما رہے ہیں۔

دوسری لڑکی کی شادی ایک رکشا ڈرائیور سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوشحال تھی۔ اس کے ہاں تین بچے ہوئے، کہ ایک شام، اس کی رکشا کو ایک تیز رو موٹر نے اٹھا پھینکا۔ حادثہ میں رکشا چکنا چور ہو گیا اور اس کا ڈرائیور وہیں ہلاک ہو گیا۔ اس کی بیوی کا اب دنیا میں کوئی نہیں تھا___ بھائی لاچار کیا کرتا۔ گیا، اور اسے تین بچوں سمیت اٹھا کر اپنے گھر لے آیا___ ایک کمانے والا (اور کمائی بھی چپراسی کی تنخواہ) اور اتنے جی کھانے والے___ اس پر مہنگائی کا یہ عالم کہ دال بھی دو روپے سیر سے کم نہ ملے۔ وہ سارا دن ملازمت کرتا۔ شام کو مختلف قسم کی محنت مزدوری کے کام کرتا۔ تب کہیں جا کر سوکھی روٹی نصیب ہوتی___ ایک دن، دفتر میں اُوپر سے ہدایات آئیں کہ بجٹ زیادہ بوجھل ہو رہا ہے اخراجات کم کئے جائیں۔ اقتصادی ماہرین کی کمیٹی بیٹھی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ چپراسیوں اور دفتریوں کی کچھ اسامیاں تخفیف میں لائی جائیں۔ اس چھانٹی میں یہ بھی آ گیا اور ملازمت سے چھٹی مل گئی۔

اب وہ گم صم سا رہنے لگا۔ اسے اسکول کے زمانے کا پڑھا ہوا ایک ہی شعر یاد تھا۔ وہ کبھی کبھی تنہائی میں اسے گنگنانے لگ

جاتا کہ ؎

عمر اپنی جو اسی طور سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ماں، قریب دو سال سے بیمار، بستر پر پڑی ہے۔ ایک بہن مولوی صاحب کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ دوسری بچوں سمیت اس کے ہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ مکانؔ (جو نانؔا کے ورثہ میں ملا تھا) بدستور اس غاصب کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ اُسے چھوڑتا ہے نہ کرایہ دیتا ہے۔ یہ غریب خود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ عمر بھر آٹے کی فکر سے ہی فرصت نہیں ملی جو اپنی شادی کا سوچتا ــــ اور وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ میں نے یہی کام سمجھ کا کیا ــــ یا یوں کہیے کہ مجبوراً سمجھ کا ہو گیا ــــ کہ میں نے اپنی شادی نہیں کی ــــ اب اس میں بامشقت کام کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ لیکن مشقت نہ کرے تو اتنے نفوس کا پیٹ کیسے پالے! یہی وہ مجبوری ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے۔

❁❁❁

آزاد پارک میں جلسہ تھا۔ ایک بہت بڑے مولانا، جو اسلام کی حفاظت کے غم میں بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے، دھواں دھار تقریر فرما رہے تھے۔ تان یہاں آ کر ٹوٹتی تھی کہ ــــ اسلام خطرے میں ہے، سخت خطرے میں ــــ!

مجمع میں سے ایک آواز ابھری کہ:

مولانا صاحب! اسلام ہے کہاں جو خطرے میں ہے؟

مولانا صاحب نے چلا کر کہا کہ اُسے پکڑو۔ یہ کمیونسٹ ہے۔ لوگوں نے اسے پکڑا، تو یہ وہی مالی کا لڑکا تھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم کمیونسٹ ہو؟ اس سوال سے وہ آتشِ خاموش جو ساری عمر اس کے سینے میں سلگتی چلی آ رہی تھی، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح پھٹ کر امنڈ آئی۔ اس نے کہا کہ میں تو ایک غریب مزدور ہوں۔ میں نے کمیونسٹ کا لفظ بے شک سنا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ ہوتے کون ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسلام کا جو نقشہ یہ حضرات ہمارے سامنے کھینچتے رہتے ہیں، وہ اگر کہیں موجود ہوتا تو اسے کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن اگر ''اسلام'' وہی ہے جس کی موجودگی میں، میری اور میرے جیسے لاکھوں مصیبت کے ماروں کی زندگی یوں گزرتی ہے، تو پھر آپ بھی سن لیں اور مولانا صاحب بھی، کہ وہ ''اسلام'' واقعی خطرے میں ہے۔ اسے ہزار مولاناؤں کے وعظ بھی نہیں بچا سکتے، کہ صحیح اسلام بھیجنے والے خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ باقی وہی بچے گا جو انسانوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کان میں کہا کہ تمہاری جھونپڑی سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ جلدی گھر پہنچو۔

(مطبوعہ طلوع اسلام، نومبر 1969ء)

❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

زبان سنبھال کر بولو

پچھلے دنوں ایک خبر آئی تھی کہ ایک شخص ایک سو بتیس گھنٹے لگا تار باتیں کرتا رہا اور اس طرح اس نے مسلسل بولتے رہنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کا سب سے باتونی شخص آسٹریلیا کا یہ باشندہ ہے۔

تم مقابلے کی ساری دوڑوں میں حصہ لینے کی کوشش کرو مگر اس مقابلے سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔ اگر آسٹریلیا کا یہ باتونی شخص ایک سو بتیس گھنٹے، یعنی چھ دن اور پانچ رات، متواتر بولتا رہا ہے تو تم اس کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ مقابلے کا شوق چل نکلا تو سب لوگ بولنا شروع کر دیں گے۔ کوئی کسی کی سنے گا نہیں اور دنیا کے سارے کام کاج دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

انسان اور حیوان میں جو بہت سے فرق ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو بولنے اور باتیں کرنے کی طاقت دی گئی ہے اور حیوان اس سے محروم ہیں۔ گوشت کا وہ لوتھڑا جسے ہم زبان کہتے ہیں انسان اور حیوان دونوں کے منہ میں ہوتی ہے مگر انسان باتیں کرتا ہے اور حیوان باتیں نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے زبان قدرت کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم زبان کے ذریعے اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اپنی خوشی غمی دوسروں کو سنا سکتے ہیں۔ زبان اور گلے کو کچھ قاعدوں کا پابند کر کے اور ان کا استعمال ایک خاص سلیقے سے کر کے ہمارے منہ سے نغمے پھوٹ سکتے ہیں۔

مگر یہی زبان۔۔۔ قدرت کی یہ نعمت۔۔۔ بڑی مصیبتیں بھی پیدا کرتی ہے۔ اس کے غلط اور ناجائز استعمال سے کئی مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ تم ہمدردی کی باتیں کر کے اسی زبان سے زخمی، مریض یا کسی اور دکھی کے دکھ کم کر سکتے ہو اور بدزبانی کر کے، گالیاں دے کر دکھی لوگوں کے دکھوں کو مزید بڑھا دیتے ہو۔ ہمارے آس پاس روزمرہ جو جھگڑے ہوتے ہیں، ان کی بڑی وجہ زبان کا غلط استعمال ہے۔ ہم بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات سوچے بغیر ہی بات کر جاتے ہیں۔ اسی لئے دانا لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تولو پھر بولو۔ بولنے سے پہلے سوچ لو کہ تمہارے منہ سے جو بات نکلنے والی ہے اس کا کوئی خراب اثر تو نہیں ہوگا۔ منہ سے جو بات نکلی وہ واپس نہیں لی جا سکتی۔ لہٰذا! آج سے طے کر لو کہ فوری طور پر تمہارے دل میں جو بات آئے اسے تم سوچے بغیر زبان پر نہیں لاؤ گے۔ ایسا کرنے سے تم بعد کی تکلیف اور شرمندگی سے بچ سکتے ہو۔

زبان کو بے لگام رکھنے سے یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص تم سے کوئی بات کرنے لگتا ہے، کوئی لطیفہ، کوئی شعر یا کوئی واقعہ سنانے لگتا ہے۔ تم ایک دو فقرے یا شعر کا ایک مصرع سن کر اسے ٹوک دیتے ہو کہ ''یہ تو مجھے پہلے ہی پتہ ہے۔'' اس سے بات سنانے والے کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بات اس بات سے مختلف ہو جو تم جانتے ہو۔ اس طرح تم

ایک اچھی اور دلچسپ بات سے محروم رہ جاؤ گے۔ اگر تمہیں وہ لطیفہ یا واقعہ پہلے ہی سے معلوم ہے جو کوئی تمہیں سنانے لگا ہے اور تم اسے دلچسپی سے اور خاموشی سے سن لو تو اس سے بات آگے چل سکتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا اندازِ بیان اسے اور دلچسپ بنا دے۔

زبان کو قابو میں رکھنے سے آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ تم ہر بات پر یہ کہہ دو گے، ''یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہے''، اور پھر دوسرے تمہیں باتیں سنانا ہی چھوڑ دیں گے۔ طالبعلم کا کام یہ ہے کہ وہ کان کھلے اور زبان بند رکھتا ہے۔ وہ بولتا صرف اسی وقت ہے جب اسے کچھ پوچھنا ہوتا ہے۔ کوئی بات سمجھنی ہوتی ہے۔

بعض اوقات زبان کا زائد استعمال بھی ہوتا ہے۔ تم ایک محفل میں بیٹھے ہوئے ہو۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ تم یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ تم اس حوالے سے کچھ نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہو، محض اس لئے بول پڑتے ہو کہ دوسرے تمہیں جاہل نہ سمجھ بیٹھیں۔ جب تم بولتے ہو تو دوسروں کو یہ یقین آجاتا ہے کہ تم واقعی جاہل ہو۔ جب تم یہ محسوس کرو کہ تم کسی خاص بات کے متعلق کچھ نہیں جانتے تو تمہارے لئے بہترین طریقہ یہی ہے کہ خاموش رہو۔ خاموشی سے دوسروں کی باتیں سنو۔ اگر کچھ جانتے ہو تو اتنی بات کرو جتنا تمہیں علم ہے۔ اپنے علم کا رعب ڈالنے کی کوشش کرو گے تو اپنی جہالت کو اور زیادہ ظاہر کرو گے۔ یاد رکھو! علم سے فخر نہیں عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

ہماری ایک اور عام عادت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص دوسرے پر تنقید کرتا ہے۔ دوسرا تیسرے پر اور تیسرا چوتھے پر اعتراض کرتا ہے اور یہ سلسلہ آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔ اب ذرا سوچو۔۔۔ اگر ہر شخص دوسرے کو بُرا کہتا ہے تو دنیا میں پھر بُرا کون ہے اور اچھا کون؟ ہر شخص بے وفائی اور بے ایمانی کی شکایت کرتا ہے، پھر بے وفا اور بے ایمان کون ہے؟۔۔۔ دراصل ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بولے جا رہا ہے۔ سب لوگ بولے جا رہے ہیں۔ اس خرابی کا علاج یہ ہے کہ آج سے ہم بولنا کم کر دیں اور جو خوبیاں ہم کو دوسروں میں نظر نہیں آتیں، وہ اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے پہل کریں۔ ہم کچھ روز خاموش رہ کر اپنے آپ کا جائزہ لے لیں کہ وہ خرابیاں جن کا ہم اس قدر چرچا کر رہے ہیں کہیں خود ہمارے اندر بھی تو موجود نہیں۔ اس جائزے کے بعد ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

اصلاح کا آغاز۔۔۔ دوسروں کی بجائے اپنی ذات سے کرنا چاہئے ورنہ یہ ہوگا کہ ہم بولتے جائیں گے، سب بولتے جائیں گے اور اصلاح کہیں سے بھی شروع نہیں ہو سکے گی۔

زبان کو قابو میں رکھو،

زبان کو سنبھال کر بولو،

ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہارے گونگا ہونے کی بددعائیں کرنے لگیں۔

❁❁❁

محمد علی صابر صدیقی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نشست نمبر 4

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

کلیم الزماں اپنے مطالعہ کے کمرے میں کسی سوچ میں بیٹھے ہیں کہ عالم آرا ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑے کمرے میں داخل ہوتے ہی بآواز بلند کہتی ہے۔

عالم آرا: ابو! آج تو آپ پکڑے گئے۔ میں نے ایم اے اسلامیات میں جو کچھ پڑھا ہے آپ کی باتوں نے اس سب پر پانی پھیر دیا ہے۔ میری حالت تو ایسی ہوگئی ہے کہ بقول شاعر "ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں"

کلیم الزماں: بیٹی! جو کچھ تم نے پڑھا ہے وہ گزرے زمانے میں ٹھیک تھا لیکن زمانہ بدل گیا ہے زمانے کے تقاضے بدل گئے، علم کی سطح ہر روز بلند سے بلند تر ہوتی جارہی ہے جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس رفعت نگاہ کا ساتھ دیں۔ علامہ اقبال نے قرآن مجید کے متعلق کہا ہے۔

صد جہانِ تازہ در آیات اوست — عصر ہا پوشیدہ در آنات اوست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

تم نے کبھی سوچا ہے کہ قرآن مجید یا دوسری آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیوں ہوئی ہیں۔

عالم آرا: میں نے تو کبھی نہیں سوچا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبروں اور کتابوں کو نازل کرنے کا مقصد کیا ہے یا تھا۔ اس قسم کے سوالات تو انسان کو لادین بنا دیتے ہیں آپ ہی کچھ بتائیے۔

کلیم الزماں: سنو جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو بکری کے بچے اور انسان کے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں جانور ہوتے ہیں لیکن ایک فرق ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بکری کا بچہ بڑا ہو کر بکری یا بکرا ہی رہتا ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ بکری کو گھاس مل جائے وہ بھی کھا لیتی اور اگر پھولوں کی ٹوکری سامنے رکھی جائے تو اس کو بھی نہیں چھوڑتی اور اگر بیمار ہو جائے تو اپنا علاج نہیں کر سکتی لیکن آدمی کے بچے میں اللہ تعالیٰ نے طبعی زندگی کو محفوظ رکھنے خیر و شر میں تمیز کرنے اور حسین اور قبیح میں امتیاز کرنے کی خاصیت ودیعت کر رکھی ہے جس کی پرورش کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور کتابوں کا سلسلہ شروع کیا جس کا خاتمہ حضور نبی اکرم ﷺ پر ہوا۔ شروع شروع میں معاشرہ سادہ سا تھا۔ لہذا قوانین یعنی شریعت کے احکام بھی سادہ تھے۔

جوں جوں معاشرہ کے مسائل پیچیدہ ہوئے اسی حساب سے شریعت کے احکام بھی بدلتے گئے اور سلسلہ اب تک جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جو لوگ کسی ایک دور کی شریعت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنا چاہتے ہیں علامہ اقبال کو ان سے اختلاف ہے۔

عالم آرا: ابو! آپ نے کہا تھا کہ قرآن کے الفاظ میں معنویت کی دنیائیں آباد ہیں۔ مجھے آپ مثال دے کر سمجھائیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! بات شروع کی تو لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ میں تم سے پوچھتا ہوں قرآن مجید میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم و رحمان ہے۔ تم اس کا مطلب جانتی ہو۔ کہ ان دو لفظوں میں علم کی ایک دنیا مستور ہے اور جس کا انکشاف صرف گذشتہ صدی میں ہوا۔

عالم آرا: میں تو سمجھتی ہوں کہ ان الفاظ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے، اور صاف ظاہر ہے کہ ہم سب اسکی رحمت کے طلبگار رہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! اس سے تو بات نہیں بنتی۔ کسی انگریز کو سمجھانا ہو تو کیسے سمجھاؤ گی۔

عالم آرا: قرآن مجید کے ترجموں میں لکھا ہے "God is Mercy"

کلیم الزمان: بیٹی! اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ سنو عرب ٹھوس Concrete چیزوں کے ساتھ فکری تصورات منسلک کرتے تھے اور قرآن مجید نے یہ طریقہ قائم رکھا ہے۔ لفظ رحیم میں ایک تدریج کا پہلو پوشیدہ ہے جیسے اسی وزن پر تعلیم کا لفظ ہے مختصراً رحیم کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کائنات اور انسان اور اسکے معاشرے کی اس طرح پرورش کر رہا ہے جس طرح ایک عورت اپنے رحم میں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اس ایک لفظ میں ڈارون کی تھیوری آف آرگینک ایوولوشن جھلک رہی ہے۔ ہمارے حکماء اور عرفاء نے بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے اس عمل کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مثلاً حافظ ابن مسکویہ اور مولانائے روم نے تو صاف لکھا ہے کہ "میں پہلے جمادی حالت میں تھا۔ پھر نباتی حالت میں آیا اس کے بعد حیوانی حالت میں رہا اور اب انسانی حالت میں ہوں۔ اسکے بعد جو بننے والا ہوں کوئی نہیں جانتا۔ ڈارون کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنی theory of Organic Evloution کیلئے ثبوت مہیا کئے، اور پھر لفظ رحمان ہے۔ اس لفظ کے اندر مشہور سائنسدان لائیڈ مارگن کی Theory of Emergent Evolution پوری آب و تاب سے عیاں ہے۔ عربی قاعدے کے مطابق جذبہ یا کیفیت یک بارگی یعنی یک لخت پیدا ہو جائے تو رحمان والا وزن استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دم غصہ آجائے تو غضبان کہا جائیگا۔ اسی طرح فوری اور سخت پیاس کے لئے عطشان بولا جائے گا۔ سائنس کی زبان میں اسے تقلیب (Mutation) کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسی عمل سے بندر نما کسی حیوان کی ایک نسل انسان بن گئی اور دوسری لڑی بندر نما ہی رہی۔ موجودہ زمانے کی تحقیق کے مطابق کچھ انسان ایسے بھی پیدا ہوئے جن کا قد صرف تین فٹ تھا۔ اس مخلوق کے ڈھانچے انڈونیشیا کے کسی جزیرے کے ایک غار میں ملے ہیں۔ اس تحقیق کا ذکر امریکہ سے شائع ہونے والے جریدے ''نیشنل جیوگرافک'' کے اپریل 2005ء کے شمارے میں کیا گیا ہے۔ یہ بحث تمہیں یہ سمجھانے کے لئے ہے کہ کائنات میں مسلسل

ارتقا ہو رہا ہے۔ اور وہ ہر گھڑی خوبصورت سے خوبصورت ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہی بات انسانی معاشرے پر بھی صادق آتی ہے جو مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ غالب نے اپنے انداز میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہاں بحث سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار و ارادہ کی خصوصیات بخش کر معاشرے کی ترقی کا انتظام تو کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی معاشرے میں خیر و شر کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اگر سچی بات پوچھو تو شر کو پیدا کرنے میں بھی در پردہ چشم یار کا منشاء کچھ اور ہے کیونکہ شر کی موجودگی کے بغیر خیر کی ترقی سست رفتار رہتی ہے۔ قصہ کوتاہ شر کی شخصی شکل شیطان کی صورت اختیار کر لیتی ہے، یعنی شر اور شیطان مترادف ہیں۔ اس حقیقت کو بھی غالب نے نہایت خوبصورت انداز میں یوں پیش کیا ہے کہ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

عالم آرا: ابو! آپ کی باتیں سن کر میری دنیا بدل رہی ہے۔ دل جھوم رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی نئی چیز مل گئی ہے۔ دل و دماغ میں بجلی کڑک رہی ہے۔ میں اپنی کیفیت بیان نہیں کر سکتی۔

کلیم الزمان: بیٹی! جب میں نے علامہ اقبال کی یہ رباعی پڑھی ؎

بیا ساقی بگر اں ساتگیں را بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمزدیں را

تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں علامہ کی نگارشات ضرور پڑھوں گا اور علامہ کے شارح علامہ غلام احمد پرویز کو بھی زیر مطالعہ رکھونگا۔ کیا بتاؤں کہ جونہی میں نے رحیم اور رحمان کی تفسیر پڑھی تو ایسا محسوس ہوا کہ نخل سینا پر بجلی کڑکی ہو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ لن ترانی لیکن علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویز کی نگارشات کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے لن ترانی کی آواز نہیں آئی۔ میرے لئے قرآن مجید کا ہر لفظ نخل سینا پر گرنے والی بجلی بن گیا ہے۔ میں تم سے یہی کہونگا کہ تم بھی قرآن مجید اسی طرح پڑھو جس طرح اقبال اور پرویز نے پڑھا تھا۔ قرآن مجید کے مروجہ تراجم اور تفاسیر سے دل و دماغ کی سیرابی نہیں ہوتی۔ علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویزؒ دوسرے علما کی طرح یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی درست ہے بلکہ ان کا موقف ہے کہ جو خیالات انہوں نے پیش کئے ہیں ان سے بہتر خیالات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہی بات ہو گئی کہ ؎

چوں کہن گردد جہانے دربرش می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب میں دوسری طرف آتا ہوں جس کے لئے تم انتظار کر رہی ہو گی۔ قرآن مجید کی ایک سورہ ہے جس کا نام ہے النازعٰت اور تم اس سورۃ کو مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ اس سورۃ کی پہلی آیت ہے والنزعٰت غرقاً اس آیت کا ترجمہ: ''آسان قرآن'' کے مؤلف جناب سید شبیر احمد صاحب نے اس طرح کیا ہے۔ قسم ہے ان فرشتوں کی جو کھینچنے والے ہیں روح کو ڈوب

کراور قرآن مجید کے دوسرے تراجم بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہونگے۔لیکن علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویزؒ کی نظر عربی ادب پر گہری تھی۔ وہ عربوں کا طرز گفتگو جانتے تھے۔مولانا حالی مرحوم نے حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں کے حالات بیان کرتے ہوئے مسدس حالی میں لکھا ہے ؎

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی

یعنی حضور ﷺ کی بعثت کے وقت عرب قوم جنگ وجدل کی وجہ سے معاشرتی طور پر پست ترین درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور یہاں سمندر کا تلازمہ باندھے ہوئے بات ہورہی ہے کہ عرب قوم جہالت، افلاس، ناخواندگی، وحشت و بربریت اور اخلاقی درندگی کے سمندر میں غرق تھی۔نازعٰت کے بنیادی معنی ہیں کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بالوں سے پکڑ کر باہر نکالنا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ آیت کے دولفظوں میں معنویت کی کتنی دنیائیں لپٹی ہوئی ہیں۔ہم تصور کرتے ہیں کہ ایک شخص یا ایک معاشرہ جہالت، افلاس، بے کاری اور بدحالی کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے، نہ وہ کسی کی بات سن سکتا ہے، نہ کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اپنی حالت بتانے کے قابل ہے۔اس کے بال پکڑ کر اسے سمندر سے باہر نکالا جاتا ہے، وہ بیہوش ہے اور اپنے آپ سے بھی آگاہ نہیں۔ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کی یہی حالت ہے جو مذکورہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔علامہ اقبالؒ اس کے قریب جاتے ہیں۔اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ آنکھیں کھولتا ہے اور پوچھتا ہے میں کون ہوں، کہاں ہوں، علامہ اسے ایک شفیق مددگار کی طرح کہتے ہیں ؎

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہمارے تبلیغی جماعت کے اصحاب پنجاب، سندھ، بلوچستان اور پختونخوا کے دور افتادہ دیہات میں جاتے ہیں۔وہ آکر بتاتے ہیں کہ چاروں صوبوں میں کچھ علاقے ایسے ہیں جن کے باسی اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں لیکن نہ تو انہیں کلمہ طیبہ سے واقفیت ہے اور نہ ہی وہ نماز پڑھنا جانتے ہیں، اور نہ ہی غلامی اور آزادی کے تصور سے آشنا ہیں۔اسی قسم کے معاشرے کے لئے کہا گیا ہے "**والنازعٰت غرقاً**"اور اسی کو افلاس اور جہالت کی غرقابی میں سے سر کے بال پکڑ کر نکالنا ہے۔اگر شہری علاقہ کے باشندوں کو دیکھیں تو وہ بھی مذکورہ بالا طبقہ سے کچھ مختلف نہیں کیونکہ کلمہ پڑھنے اور نماز، روزہ قربانی اور حج وزکواۃ کی پابندی کے باوجود دین اسلام کی حقیقت اور مقصد سے بے خبر ہیں۔علامہ اقبالؒ ہوں یا غلام احمد پرویز یا ان کے ہم خیال دانشور وہ سب اسی طبقہ کو جہالت کے سمندر سے کھینچ کر بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔اقبال ان سے کہتے ہیں کہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے اور اس کام کو کرنے والوں کو کہتے ہیں ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

اس پر عمل کرتے ہوئے علامہ اقبال نے جوانی میں پہلوانی کی تھی۔تشکیل پاکستان کے وقت تک تو گورنمنٹ کالج لاہور کی گیلری میں ریسلنگ ٹیم کی گروپ فوٹو گراف میں انہیں پہلوان کے روپ میں دیکھا جاسکتا تھا اور جب پیکر خاکی مضبوط ہو

جائے تو کہتے ہیں ۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

عالم آرا: ابو! کمال کر دیا آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں تو علامہ اقبال کو دوسرے شعراء کی طرح ایک شاعر سمجھتی تھی۔

کلیم الزماں: بیٹی سنتی جاؤ ابھی تو حالت یہ ہوگی کی افسانہ از افسانہ می خیزد۔ فی الحال تم مجھے چائے کی گرما گرم پیالی دے دو۔ چائے آئی، کلیم الزماں اور عالم آرا نے گھونٹ گھونٹ مزے لے کر چائے پی، تھوڑی دیر تک تو خاموشی رہی۔ پھر عالم آرا نے کلیم صاحب سے کہا۔

عالم آرا: ابو! بات علامہ اقبال کے متعلق ہو رہی تھی۔ کچھ بتایئے ان کے متعلق اور ان کی تعلیمات کے متعلق کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔

کلیم الزماں: علامہ نے قوم کو مخاطب کر کے دو شعر ایسے کہے ہیں کہ میں جب انہیں پڑھتا ہوں تو مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ہیں ۔

بہ سواد دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من

ہمہ خاوراں خوابے کہ نہاں ز چشم انجم بہ سرود زندگانی سحر آفریدہ ام من

بیٹی! یہی نہیں کہ انہوں نے نظری طور پر ہی قوم کی راہنمائی کرنے تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہو۔ بلکہ عملی طور پر اپنے خیالات اور فلسفہ کی تنفیذ کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ اس مجوزہ یونیورسٹی کا ابھی بلو پرنٹ ہی تیار ہو رہا تھا کہ علامہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور یونیورسٹی کے در و دیوار پر ''پٹھان کوٹیئے'' قابض ہو گئے۔ ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ''(11:114) کے جذبہ کے تحت میں وہی کام چھوٹے سے پیمانے پر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی ایک کوٹھی اس کے لئے مختص کر دی ہے اور مقامی یتیم خانے کے بچوں میں سے تیس چالیس بچے اپنی تحویل میں لینے کے لئے یتیم خانہ کی انتظامیہ سے گزارش کی ہے اس کے ساتھ میں ان بچوں کی تمام تعلیمی اور طبعی ضرورت کا ذمہ دار اور کفیل ہونگا۔ ابھی معاملہ ابتدائی مراحل میں ہے۔ جب تمام امور طے پا جائیں تو درسگاہ کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ عقیل الزماں صاحب کے پاس تو شاید زیادہ وقت نہ ہو کہ درسگاہ کی دیکھ بھال کر سکیں یہ کام تمہیں ہی اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا، یہاں تو بات سے بات نکلتی ہے تمہیں ایک تاریخی واقعہ سناتا ہوں۔ برطانیہ کے بادشاہ چارلس اول کا نام تو سنا ہوگا۔ بڑا جابر اور ظالم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے بادشاہت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جا سکتی اسی زمانہ میں ایک سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا جو معاشرے میں بڑا مقبول تھا۔ ایک دن کنگ چارلس لندن کی گلیوں میں گشت کرتے کرتے مذکورہ ہیڈ ماسٹر کے سکول جا پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر کو اپنے دفتر میں موجود نہ پا کر چارلس نے کلاسوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک کلاس

میں پڑھا رہے تھے۔ چارلس ان کی کلاس میں جا بیٹھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے بادشاہ سلامت کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ کی۔ ہیڈ ماسٹر کا رویہ کچھ یہ تھا کہ انہیں پروا نہیں تھی کہ گاؤ آمد و خرر فت۔ تھوڑی دیر کلاس میں رہنے کے بعد چارلس ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں جا بیٹھا اور جب کلاس ختم کر کے ہیڈ ماسٹر اپنے دفتر پہنچا تو بادشاہ سلامت کو دیکھ کر اس نے ایک ایسی بات کہی جو تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بادشاہ سلامت سے کہا

Your majesty it was not due to disrespect that I did not pay any heed to you, but the fact is I do not want my children to know that there is any body bigger than me in London. Only then I can teach them.

روایت ہے کہ بادشاہ ہیڈ ماسٹر کی بات سن کر مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر نکل گیا۔

بیٹی عالم آرا: میں چاہتا ہوں کہ جو درسگاہ میرے تصور میں آ رہی ہے اس میں استادوں کا مقام ایسا ہی بلند ہو۔ معلوم نہیں برطانیہ کے حالات آج کل کیسے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ اگر دکاندار کو معلوم ہو جاتا کہ گاہک ایک استاد ہے تو وہ احتراماً کرسی سے اٹھ کر اس سے بات کرتا تھا۔ کبھی ہمارے ہاں بھی یہ روایت تھی۔ پروفیسر گوہر علی شاہ مرحوم کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ایک دفعہ ایک دوست کے ساتھ اپنے وقت کے مشہور رومانی شاعر اختر شیرانی سے ملنے گئے۔ اختر شیرانی بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ شراب بہت پیتے تھے۔ دوست کو دیکھتے ہی تکیے کے نیچے سے بوتل نکالی اور ایک گھونٹ پی کر دوست کا استقبال کیا اور تعارف پر جب اسے معلوم ہوا کہ دوسرا شخص جغرافیہ دان ایک پروفیسر ہے جو اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھاتا ہے تو اختر شیرانی بستر سے کود کر کھڑا ہو گیا اور گوہر علی شاہ سے کہا کہ مجھے معاف کر دیجئے میں نہیں جانتا تھا کہ آپ استاد ہیں۔ یہ لوگ میری نسل کے استاد اور شاگرد تھے۔ میں کچھ مزید تبصرہ کرنا نہیں چاہتا تمہیں یہ کہانیاں اسلئے سنا رہا ہوں کہ ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں آں قصۂ پارینہ را

آمدم برسر مطلب میری مجوزہ درسگاہ ملک کے دوسرے سکولوں سے مختلف ہوگی۔ جہاں تعلیم کے نام پر صرف معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ جہاں لیلیٰ مجنوں کے قصے سنائے جاتے ہیں۔ شیریں فرہاد، بیستوں اور تیشہ فرہاد کی بات کی جاتی ہے۔ بیٹی اب وہ پرانے قصوں کا زمانہ گزر گیا ہے۔

جوئے شیر و بیستوں افسانۂ دیرینہ است جوئے خوں آوردن و جان کندن ایجادِ من است

یہ مولانا گرامی کا شعر ہے۔ مجھے اب اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ موجودہ زمانہ جان کنی کا زمانہ ہے بے تحاشا محنت کی ضرورت ہوگی۔

عالم آرا: ابو! یہ چھوٹی سی درسگاہ کیا کیا کام کرے گی۔ یہ میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لوں۔

کلیم الزماں: بیٹی! میں نے ساری عمر وکالت بھی کی ہے اور عدالت کی کرسی پر بھی بیٹھا ہوں۔ اسلئے حقیقت پسندی میری رگ رگ میں موجود ہے۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ ہماری درسگاہ صرف دہی میں جاگ کا کام کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری درسگاہ سے فیضیاب ہونے والے بچے بڑے ہو کر اپنے زمانے کے سرسید بن جائیں اور علمائے اخلاق اور علمائے شعر و ادب کے ساتھ ماہرین علم و فن بھی پیدا ہوں اور ان سے بھی اہم بلکہ اہم ترین وہ علوم ہیں جن کا جاننا کرہ ارض پر انسانی

زندگی کے لئے ضروری اور لابدی ہے۔

عالم آرا: ابو! میں روزانہ اخبار بینی کر لیتی ہوں اور ملک کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہوں۔ آپ کے ذہن میں جو بات کلبلا رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ عمران خان، ابرار الحق، پروفیسر عطاالرحمن، پروفیسر جاوید لغاری اور شہزاد رائے قسم کے درد دل رکھنے والے معلموں کی ایک کھیپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اپنی قبروں کے لئے سویٹزر لینڈ یا دوبئی میں زمین خرید رکھی ہے وہ آپ کو اپنی کوششوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

کلیم الزماں: بیٹی! میں اسی درسگاہ میں ایسے نوجوان بھی پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جن کے اندر گولکنڈہ کے سربراہ محمود گواں کی روح رقص کر رہی ہوگی۔ میرا خیال ہے اور ممکن ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں لیکن میرا خیال یہی ہے کہ طبعی علم کے بغیر شعر و ادب میں نہ تو مطالب کی گہرائی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور نہ وسعتِ ادراک، بلکہ اپنے ماحول سے واقفیت نہ ہو تو انسان معنوی طور پر گونگا اندھا اور بہرہ رہتا ہے۔

عالم آرا: آپ کی بات میرے سر کے اوپر سے گزر گئی ہے بہر حال آپ کی سکیم بڑی عمدہ ہے اور جہاں آرا بہن بھی ہماری مدد کر سکتی ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! یہ کام میں نے اور تم نے مل کر کرنا ہے۔ عقیل صاحب بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور شکیل صاحب! اپنی کرکٹ سے اکتا گئے تو ان سے بھی امید رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن جہاں آرا کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کے سسرالی ڈھول ڈھمکے والے ہیں۔ مزاروں پر حاضری دینا، عرسوں میں شریک ہونا، جلوس نکالنا یا ان میں شرکت کرنا اور میلاد کی محفلیں گرم کرنا، ان کے ہاں یہی مقصد حیات ہے اور جہاں آرا کو ان کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ میں بھی کچھ نہیں کہتا کیونکہ نازک رشتہ ہے اور پھر میں تو میر انیس کی نصیحت پر عمل کرنے کا قائل ہوں جنہوں نے فرمایا تھا:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اپنی آئندہ نشست میں اس پر گفتگو ہوگی کہ علامہ اقبال نے جس معاشرے کو جہالت اور افلاس کی غرقابی سے نکالنا چاہا ہے اسے کیا کرنا ہوگا، کیونکر کرنا ہوگا۔ اتنا جانتا ہوں کہ علامہ اقبال ہمارے روشن مستقبل کے متعلق یہ پیش گوئی کر گئے ہیں کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

میں تھک گیا ہوں اب تم بھی تھک گئی ہوگی، اب آرام کرو۔

عالم آرا: ابو مجھے یہ سمجھاتے جایئے کہ شعر و ادب کا ماحول سے کیا رشتہ ہے۔ شعر تو دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔

کلیم الزماں: میں اس وقت لمبی بحث کے موڈ میں نہیں۔ صرف ایک بات کہتا ہوں کہ کیا برفانی علاقہ میں رہنے والا ایک ایسکیمو یہ شعر کہہ سکتا ہے یا سمجھ سکتا ہے۔ سوچتی رہو رات بھر۔

چار تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو بجلیوں کو بھی طوافِ آشیاں کرنا پڑے

جمیلہ خاتون پالوی، بھارت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خواتین کا صفحہ

عورت اور قرآن

''مشرق'' عنقریب ہی ایک نئی کروٹ لینے والا ہے اور اس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں میں ''عورت'' کی تعداد زیادہ ہے۔ نیز دنیا ہر لمحہ، ترقی کے زینے طے کر رہی ہے۔ ملوکیتؔ، پیشوائیتؔ، سرمایہ پرستیؔ، نسلی امتیازاتؔ، طبقاتی تقسیم اور جغرافیائی امتیازات کی بندشیں ٹوٹ رہی ہیں اس لئے لامحالہ مسلمان عورتوں کے سامنے بھی بہت سے مسائل آئیں گے اور انہیں اپنے ان حقوق کے لئے، قرار واقعی جاننے اور حاصل کرنے کی سعی و کوشش کرنا ہوگی، جو انہیں ''قرآن مجید'' نے عطا کئے ہیں۔ چنانچہ اس کی داغ بیل پڑ بھی گئی ہے۔ 1948ء میں مصر میں ''بنت النیل'' کے نام سے اور 1951ء میں ''بنت الپاکستان'' کے عنوان سے پاکستان میں انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد بتائے جو بھی جائیں، مگر مدعا یہ ہے کہ ''مسلمان عورت'' پر جو مختلف قسم کی غیر انسانی اور غیر قرآنی پابندیاں اور قید و بند لگا رکھی گئی ہیں اُن کو مطلقاً توڑ دیا جائے۔ بالفاظ دیگر کوشش یہ ہے کہ ''مردوں'' کے ناروا مظالم سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ یہ ردِعمل ہے اس کا کہ اگرچہ ''اسلام'' یا ''قرآن مجید'' نے اپنے امتیازی نصب العین اور خصوصی نظام کے پیش نظر ہیئت اجتماعیہ میں، باستثناء چند ''مرد'' و ''عورت'' دونوں کو مساوی حقوق دیئے، مگر وہ حقوق قرار واقعی ''عورت'' کو ملے نہیں۔ یا یوں کہیے کہ بُری طرح غصب کر لئے گئے۔ مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی سکریٹری جمعیۃ علماء ہند نے اپنی کتاب ''اخلاق اور فلسفۂ اخلاق'' کے صفحہ 322 پر، جو 1940ء میں شائع ہوئی تھی اعتراف کیا ہے کہ:

> ''اسلام نے معدودے چند مسائل کے علاوہ اگرچہ ''عورت'' کو تمام حقوق میں ''مردوں'' کے مساوی رکھا ہے مثلاً تعلیم کا حق دونوں کے لئے برابر ہے۔ اپنی مملوکہ اشیاء میں قانونی تصرفات کا مردوں ہی کی طرح پورا حق عطا کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر عملاً ان حقوق سے ''عورت'' پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اموال کی ذمہ داری یا تو کسی قریبی عزیز کے سر ہوتی ہے اور یا کوئی وکیل ان کی طرف سے تصرف کا مختار ہوتا ہے اور عورتیں براہ راست ان معاملات میں بے دخل رہتی ہیں۔ اس طرح نکاح تک کے معاملے میں صرف والدین ہی مجاز کل ہیں اور اُن کی اپنی رائے کی قطعاً پرسش و پروا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان کو یہ بھی حق نہیں ہے کہ وہ ہونے والے شوہر کو ایک نظر دیکھ ہی لیں۔ اور ولی اگر اُن سے کسی قسم کا مشورہ بھی کرتا ہے تو وہ محض ایک رسمی صورت میں اور بس۔ نیز اُن کو ایک لمحہ کے لئے اس کی بھی اجازت نہیں ہے

کہ وہ معمولی حیوان کی طرح کھلی ہوا سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ باغات کی سیر کر سکیں اور اپنے شوہروں کے دوش بدوش تفریح گاہوں میں تفریح کر سکیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی ان امور کی جرأت کر بیٹھے تو گویا اُس نے خود کو طعنوں اور ملامتوں کے لئے پیش کر دیا۔ مصر تک میں بہت کم لڑکیاں یونیورسٹی میں علم حاصل کرتی ہیں۔ اور اُن کی تعداد کے اعتبار سے ثانوی مدارس میں بھی کم ہی پائی جاتی ہیں اور ابھی تک انہوں نے یہ بھی نہیں سمجھا کہ اُن کے حقوق ''غصب'' کر لئے گئے ہیں، تاکہ وہ مطالبہ کرنے پر آمادہ ہوں۔''

مولانا موصوف کا یہ بھی فرمانا ہے کہ:

''بیشک اسلام، نہ اس ''افراط'' کی اجازت دیتا ہے جو آزادیٔ حقوق کے نام سے مغرب، اور مغرب زدہ ملکوں میں عملاً پائی جاتی ہے اور جہاں ''عورت'' کی ''جنسی مساوات'' کے ساتھ ساتھ ''صنفی مساوات'' کو بھی تسلیم کر لیا گیا۔۔۔ اور نہ وہ اس ''تفریط'' کا قائل ہے جس کی بدولت جہالت کے ہاتھوں ''عورت'' کے ساتھ ایک ''باندی''، ''مملوکہ'' یا ''حیوان'' کا سا سلوک کیا جائے۔'' (صفحہ:336)

بلاشبہ وہ دور گزر گیا جب مرد ''عورت'' کو ایک جانور سمجھتے تھے۔ اب ''عورت'' کو ہوش آ گیا ہے کہ وہ بھی ''انسان'' ہے۔ لہٰذا ''مرد'' کو بقول نیاز فتح پوری:

اب تاریخ کو صرف اس لئے نہ پڑھنا چاہئے کہ وہ مرد کی تاریخ ہے۔ تمدن کا مطالعہ صرف اس لئے نہ کرنا چاہئے کہ وہ مرد کے قوائے دماغی کا نتیجہ ہے بلکہ اب تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھ کر کرنا چاہئے کہ تمام اعمال انسانی میں ''عورت'' بھی پوری پوری حصہ دار ہے۔ ''تہذیب جدید'' نے ''عورت'' کو علمی و عملی میدان میں بھی ''مرد'' کے دوش بدوش کام کرنے کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ اور آج کل یورپ کی معاشرت اس کی شہادت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اسی کے ساتھ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ''عورت'' کی حالت گر گئی ہے، اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ ''عورت'' کے لئے تعلیم جدید یا اس کی آزادی مفید نہیں ہو سکتی، مگر ایسا خیال کرنا حقیقتاً واقعات سے غلط نتیجہ اخذ کرنا ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ''عورت'' کی تربیت کی طرف کبھی بھی صحیح اعتنا نہیں کیا گیا اور اس کا وہ اخلاقی زوال جو ازمنۂ قدیمہ سے شروع ہوا تھا اب بھی بدستور جاری ہے۔'' (صحابیات، ص:10)

حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

قصور ''زن'' کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اُس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ ''مرد'' سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

مگر ''عورت'' کو بھی عقل سے کام لینا ہوگا۔ ہم عورتیں بظاہر آزادی کے سارے مراحل، حسبِ خواہش طے بھی کر لیں تو ہماری اسیری بہ باطن دور نہیں ہوسکتی ہم کامل آزاد ہو کے بھی قوانینِ الٰہیہ کے پیشِ نظر فطری طور پر ''مرد'' کے تعلق وتسلط سے آزاد نہیں ہوسکتے کیونکہ ہماری جبلی کمزوری کچھ سہارا چاہتی ہے۔ ہمارے رنگ کی شوخی کپڑے کی محتاج ہے۔ ہماری شمع جب ہی اطمینان سے جل سکتی ہے جب فانوس ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے ۔

بظاہر بوئے گل کو باغ میں حاصل ہے آزادی مگر موج ہوا میں وہ اسیرِ دام ہوتی ہے

(الم مظفر نگری)

میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مصر کی مشہور تنظیم ''الاخوان المسلمون'' کے روشن ضمیر لیڈر شیخ حسن الحدیبی ۔۔۔ نے بہت عمدہ خیال ظاہر کیا ہے۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا کہ:

''آپ زندگی کے تمام دوائر میں عورتوں کی شرکت کے روادار ہیں یا نہیں؟'' تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں کام کرنے کا حق مردوں اور عورتوں کو مساوی طور پر عطا کیا ہے، اگرچہ عورتوں کا فطری دائرہ عمل خانہ داری اور پرورش وتربیت اطفال ہی ہے لیکن اگر عورتیں اپنے اس بنیادی کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے بعد اتنی فرصت واستطاعت اور اہلیت رکھتی ہوں کہ زندگی کے دوسرے دوائر میں مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کرسکیں تو اسلام ان کو ہرگز منع نہیں کرتا۔ چنانچہ میری دو لڑکیوں نے ڈاکٹری اور نرسنگ کی باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل کی تھی اب شادیاں ہوجانے کے بعد وہ اپنے گھروں کے اندرونی وظائف کو بھی بہ حُسن وخوبی انجام دے رہی ہیں اور ڈاکٹری اور نرسنگ میں بھی ملک کی خدمت بجالا رہی ہیں۔''

''الاخوان المسلمین'' کے امام کا عورتوں کے حقوق وفرائض سے متعلق، قطعاً وہی خیال وعقیدہ ہے جو اسلام کی دستوری کتاب ''قرآن'' میں پیش کیا گیا ہے۔

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع

اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے

ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی نظام کے قیام سے مقاصد عالیہ حاصل ہوتے ہیں

میں آپ سے محوِ گفتگو ہوں اور بار بار میرے ہاتھ، میرے پاؤں، میری آنکھ، میری روح، میری جان ذکر کرتا ہوں۔ جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میں اپنی ان چیزوں کو جس شے کی طرف نسبت دے رہا ہوں۔ وہ شے میرے جسم کے علاوہ کوئی اور شے ہے۔ مجھے اطلاع ملتی ہے کہ مجھے اپنے محکمہ میں ترقی مل گئی ہے جس سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میرے ایک قریبی دوست کی وفات ہوگئی ہے تو مجھے اس سے بہت رنج ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات رنج، حسد، لالچ وغیرہ کی کیفیات لوگوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اس میں سے کسی شے کا تعلق میرے جسم سے نہیں ہے۔ اپنی ترقی پر میں جب خوش ہوتا ہوں تو میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میرا بازو، یہ خوشی محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ ایک شے جو ہر وقت میرے ساتھ ہے، وہ یہ خوشی محسوس کرتی ہے۔ دوست کے انتقال پر جب رنج ہوتا ہے تو یہ رنج میرے سر یا پیر کو نہیں ہوتا، یہ رنج اسی شے کو ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہے۔ قرآن کریم نے اس شے کو لفظ نفس سے تعبیر کیا ہے ارشادِ عالی ہے وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ﴿۷﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ۚ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۹﴾ (9-32:7)، خدا نے انسانی تخلیق کے سلسلے کی ابتداء بے جان مادے سے کی۔ پھر اسے مختلف ارتقائی منازل سے گزارتے ہوئے اس مقام پر لے آیا جہاں اس کی نسل کی افزائش سلسلہ تولید سے ہونے لگی۔ اس مقام تک انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ پھر اس نے اس سے حشو وزوائد الگ کرکے اس میں خاص اعتدال پیدا کیا اور اپنی توانائی کا ایک شمہ ڈال دیا اور اس طرح تمہیں سماعت، بصارت اور قلب عطا کرکے، اس قابل بنا دیا کہ تم مختلف علوم حاصل کرسکو۔ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۹﴾ (32:9) لیکن تم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ یہ شے انسان کے سارے جسم میں ہوتی ہے۔ کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ انسان کا نفس اس کے سر میں ہے۔ یا اس کے پاؤں میں ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ہے لیکن ہر جگہ ہونے کے باوجود یہ تعین نہیں ہوسکتا کہ وہ جسم کے کس حصہ میں ہے۔ بعض اوقات کسی حادثہ کی وجہ سے ایک شخص کی ٹانگیں اور بازو کٹ جاتے ہیں پھر بھی اس کا نفس اس کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ جسم کے کٹ جانے کی وجہ سے اس کی اس شے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جسم کم ہوجائے اور اس کا یہ نفس بڑھتا جائے۔ ایک آدمی اگر حادثہ میں جسم کم ہونے کے بعد کوئی خطیر رقم اللہ کے دین کی مدد کے لئے دے دے، یا کسی فلاحی کام کے لئے دے دے تو اس کے نفس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ جسم کے بڑھ جانے یا کم ہوجانے سے نفس پر کوئی

اثر نہیں پڑتا۔ یہاں تک کہ انسانی جسم کی موت آنے کے بعد بھی نفس انسانی زندہ رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بو الحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

دنیا کے ساتھ عجائبات میں سے ایک عجیب چیز HELEN KELLER بھی تھی۔ HELEN KELLER، نابینا، گراں گوش، اور گونگی تھیں۔ وہ نہ دیکھ سکتی تھیں، نہ سن سکتی تھیں اور نہ ہی بول سکتی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جسمانی صلاحیتوں کی کمی کے باوجود ان کے نفس میں کوئی کمی نہیں تھی۔

قرآنِ کریم نے عقل، شعور اور قلب سب الفاظ کو چھوڑ کر انسان کی اس زندگی کے لئے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس نفس پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جو فرد یا جو قوم اس نفس پر ایمان نہیں لاتی تو وہ انسانیت کے معیار پر ہی نہیں آتی جو فرد یا قوم اس نفس پر ایمان نہیں لاتی وہ حیوانیت کی سطح پر زندگی بسر کرتی ہے نہ اسے وحی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی مستقل اقدار کی۔ اسے دین کی بھی کوئی ضرورت نہیں جو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لاتا ہے۔ اس قوم کا تصورِ حیات ہی مادی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کا تصورِ حیات نفس انسانی کی پرورش پر استوار ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کی اساس انسانی ذات کے یقین پر ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد جسم انسانی کے ساتھ ساتھ اس ذات کی نشوونما کرنا بھی ہے۔ ذات اپنے سارے ارادے اور مقاصد جسم کے ذریعے بورے کرتی ہے۔ اس لئے جسم کی پرورش بھی ضروری ہوتی ہے لیکن اصل مقصود بالذات، ذات کی نشوونما کرتا ہوتا ہے۔ ذات کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔ مستقل اقدار پر عمل اور صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرنے کا عمل، صرف اسلامی نظام میں ہی ہوسکتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں ان دونوں چیزوں پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قرآن کی رُو سے اسلامی نظام قائم کرنا ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔ اسی لئے اُمتِ مسلمہ کا 14 سو سال سے اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلامی نظام کا قائم کرنا ہر فرد پر واجب ہے اور جو شخص اسلامی نظام کے قیام کی فرضیت اور اس کے وجود سے انکار کرتا ہے، وہ کافر، ظالم اور فاسق ہوتا ہے (5:44، 5:45، 5:47) اس تمہید کے بعد اب ہم اصل مضمون کی ابتداء کرتے ہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت چاروں طرف روح انسانی کا تصور پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر اس موجودہ دور تک روح انسانی کا تصور ہی عام ہے۔ ہر جگہ ہر مذہب میں روحانیت کا دور دورہ ہے۔ روحِ انسانی ہی ہر مذہب کی بنیاد ہے۔ مغربی ممالک میں Progressive حلقوں میں بھی ''Spirituality'' پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ہمارے مشرقی ممالک بھی تصوّف و یدانت اور روحانیت کو اہم مقام دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں روح کا لفظ بیس (20) مرتبہ آیا ہے۔ لیکن روحانیت کا لفظ ایک مرتبہ بھی نہیں آیا۔ روح کا لفظ 17 مقامات پر وحی، وحی لانے والا، وحی پانے والا کے معنوں میں آیا ہے۔ البتہ تین مقامات پر یہ لفظ نفخ روح کے معنی میں آیا ہے (15:25، 38:72، 32:9) کہ ہم نے انسان کو ایک صلاحیت عنایت فرمائی ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے زندگی The Life ہزاروں، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی، جمادات، نباتات کی

منازل طے کر کے حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی عنایت فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ کریم کا اعجاز یہ ہے کہ جب تک یہ توانائی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہی جاتی ہے اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو، بطور ایک نوع کے ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرنے لگ جاتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے موسوم ہونے لگ جاتی ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممتاز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے انسان ''جسم اور نفس'' کا مرکب ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے لیکن قرآن روحِ انسانی کا قائل نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے روح کی تربیت کے کوئی اصول نہیں بتائے اور نہ ہی اس کے تزکیہ کا کہیں حکم دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے جو روح اور نفس میں امتیاز کیا ہے یہ اس کا ایک بڑا اعجاز ہے۔ اس مضمون میں آگے چل کر آپ کو اس کا اندازہ ہوگا۔

قرآنِ کریم نے روح اور نفس میں جو امتیاز کیا ہے وہ اس کا اعجاز ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ، تو یہ فرق سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ غضب یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بھی اس فرق کو Detect نہیں کیا اور اس فرق کو نہ بھانپنا ہی ان کے زوال کا سبب بنا۔ چودہ سو سال اسی طرح گزر گئے لیکن ہمارے علماء نے اس فرق کو اہمیت ہی نہیں دی۔ تحریک طلوع اسلام وہ واحد تحریک ہے جس نے اس فرق کو محسوس کیا۔ جو قوم روحانیت کی قائل ہوگی وہ ہمیشہ زوال پذیر رہے گی کیونکہ روحانیین نے روح کو مادہ کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ ان کے خیال میں مادی ترقی روح کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ان کے خیال میں یا روح میں ترقی ہوسکتی ہے یا مادی کائنات میں۔ پھر یہ روحانیین اس کائنات کے وجود کے ہی قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے غالب کا صرف ایک شعر ہی ان کے تمام نظریات کو Sum-up کر دیتا ہے اس نے کہا:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

نیز کہا۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اس پر مستزاد یہ کہ یہ حضرات حواس سے حاصل کردہ علم کو علم شمار ہی نہیں کرتے۔ یہ حضرات صرف اس علم کو علم تسلیم کرتے ہیں جو باطنی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے علم صرف اس کو گردانا ہے جو سماعت، بصارت اور فواد سے کام لینے کے بعد حاصل کیا گیا ہو (17:26) آپ خود غور فرمائیں جس قوم کے یہ نظریات ہوں وہ کس درجہ پست حالت میں جاسکتی ہے۔ روح کی ترقی پرستش کے ذریعے ہوتی ہے۔ نوافل، وظائف روح کی پرورش کے ذرائع ہیں۔ یہ رسومات پرستش ہر جگہ ادا کی جاسکتی ہیں۔ ان رسومات کے ادا کرنے میں کسی نظام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے ذہن سے اسلامی نظام کا تصور ہی محو ہوگیا۔ اسلامی نظام مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس

نظام میں اللہ کے قوانین واحکامات جاری ہوتے ہیں اس لئے ان کی اطاعت سے نفس انسانی میں توسیع ہوتی ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط (2:286) خدا جو تم پر یہ حدود عائد کرتا ہے تو یہ اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہوتی ہے لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ ط (2:286) ذات کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ قانون مقرر فرمایا ہے کہ جو غلط عمل ہوتا ہے اس کا نقصان بھی اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے اور جو درست عمل کرتا ہے اس کا فائدہ بھی اسے ہی ہوتا ہے۔

مذہب کی بنیاد روح پر ہوتی ہے اور روح کی پرورش پرستش سے ہوتی ہے۔ اس لئے مذہب زدہ لوگوں کو نہ تو اسلامی نظام کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ہی پرستش کے ذریعے اطاعتِ خداوندی ہوتی ہے۔ یہ حضرات پرستش اور اطاعت کے درمیان فرق کو نہیں سمجھتے۔ پرستش ہر جگہ ہوسکتی ہے اسے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دین کی بنیاد نفس پر ہوتی ہے۔ نفس کی تربیت میں پرستش کا دخل نہیں ہوتا۔ نفس کی پرورش اطاعت خداوندی کے ذریعے ہوتی ہے اور اطاعت خداوندی صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے۔ جہاں اللہ کے قوانین نافذ ہوتے ہیں اس لئے اسلامی نظام قائم کرنا ضروری ہے کہ صرف اور صرف اس نظام میں رہ کر نفس کی نشوونما ہوسکتی ہے۔ چونکہ نفس کی پرورش کرنا زندگی کا مقصد ہے اس لئے اسلامی نظام کی اہمیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اسلامی نظام کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ جو حضرات یا جو تحریکات اس وقت بھی اقامت دین کے لئے اُٹھی ہیں وہ بھی روح اور روحانیت اور پرستش کے قائل ہیں تشیع میں اسلامی نظام کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہاں کے علماء نے ایران میں اسلامی حکومت قائم کردی تھی۔ مزید حیرت وتحیر اس بات پر ہوتی ہے کہ علماء ایران اسلامی حکومت قائم کرنے کے باوجود پرستش کے قائل بھی رہے اور پرستش کرتے بھی رہے۔ مصر میں اخوان المسلمون اور ہمارے ملک عزیز پاکستان میں جماعت اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی تنظیم اسلامی دونوں اقامت دین کی داعی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ لوگ بھی پرستش کے قائل ہیں۔ مسلمان جب تک روحِ روحانیت اور پرستش کے قائل رہیں گے نہ اسلامی نظام قائم کرسکیں گے، نہ اطاعتِ خداوندی سے مالا مال ہوسکیں گے اور نہ ہی اس دنیا میں ترقی کرسکیں گے۔ مسلمانوں کو اپنے زوال کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کریں اور اسلامی نظام کی اطاعت کو ہی عبادتِ خداوندی شمار کریں اگر آپ اسلامی نظام کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی نہیں سمجھتے بلکہ اس نظام میں رہتے ہوئے بھی اس نظام کی اطاعت کو عبادت سمجھنے کے بجائے صرف پرستش کی رسومات کو عبادتِ خداوندی سمجھتے رہیں گے تو اس طرح اوّل تو یہ نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا اور اگر قائم ہوگیا تو یہ جاری نہیں رہ سکے گا۔ اسلامی نظام کے قوانین کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ جب آپ اسلامی نظام کے واجبات Revenues اور اس کے Taxes ادا کرتے ہیں تو اس کی ادائیگی خود عبادت خداوندی ہوتی ہے اسلامی نظام میں بجلی، سوئی گیس، ٹیلی فون، پانی کے بل ادا کرنا عبادتِ خداوندی ہوتی ہے اسلامی نظام کی عدالتوں کے فیصلے تسلیم کرنا اور ان

کی اطاعت کرنا عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اسلامی نظام کی ساری عدالتیں قرآنی عدالتیں ہوتی ہیں اس میں فرقہ وارانہ شریعتی عدالتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ مذہب کا تصور ہے۔ یہ عدالتیں وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو مذہب کو دین بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنی نظام کی ساری عدالتیں، تحصلیں، تھانے، سب مساجد اللہ ہوتے ہیں کیونکہ یہاں سے قوانین خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ اس نظام کے سارے SYMBOLS شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ اس نظام کا جھنڈا Flag، کرنسی، پاسپورٹ، ویزا، شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ اس نظام کے افسران حاملین عرش الٰہی کہلاتے ہیں (39:75)

ہمارے ہاں یہ نظریہ عام طور پر مروج ہے کہ ہندوستان میں اولیاء کرام نے اسلام کی بڑی تبلیغ کی اور لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنالیا۔ اس سلسلہ میں اولیاء اللہ کی بڑی تعریف کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ صوفیاء کرام اپنے دور کے بادشاہوں کو دین کا راستہ دکھا دیتے اور اُنہیں اقامت دین کے لئے مجبور کرتے، تو آج سارے کا سارا ہندوستان مسلمان ہوتا۔ اگر کہیں قرآنی نظام قائم ہوجاتا ہے تو دوسرے نظام اس نظام کے سامنے برف کی طرح پگھلنے لگتے ہیں۔ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ (110:2)، کیا تم نے دیکھا کہ لوگ اس دین میں فوج درفوج داخل ہورہے ہیں۔ خود فوج کے لفظ میں کثرت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے اور اس لفظ میں تیزی بھی شامل ہوتی ہے۔ پورے ہندوستان میں اگر ایک جگہ بھی اس دور کا مسلمان بادشاہ دین قائم کردیتا۔ تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔ لیکن اس میں بادشاہوں کا قصور نہیں کیونکہ ان علماء نے اُنہیں دین کا راستہ ہی نہیں بتایا۔ دین کا تصور خود ان علماء کے سامنے نہیں تھا وہ خود سب روحانیت زدہ اور تصوّف کے قائل ہوتے تھے۔

اولیاء لفظ ولی کی جمع ہے اور ولی کے معنی دوست کے ہوتے ہیں ارشادِ عالی ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ (60:1) ترجمہ: اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔ اس آیت میں مسلمانوں کے دشمن تو ظاہر ہے اسرائیل اور بھارت ہیں، مگر اللہ کا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا دشمن وہ ہے جو اس کے دین کا دشمن ہے اور اس کی اقامت میں دشمنی کرتا ہے وہ اللہ کا دشمن ہے اسی مضمون کو سورہ انفال میں دہرایا گیا ہے ارشاد ہوا وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ (8:60) ترجمہ: اے ایمان والو اور ان سے لڑائی کے واسطے قوت میں سے جو کچھ جمع کرسکو جمع کرلو اور پلے ہوئے گھوڑے تاکہ تم اس قوت سے اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو۔ اس آیت میں بھی مسلمانوں کے دشمن تو واضح ہیں کہ وہ کفار و مشرکین ہیں لیکن اللہ کے دشمن وہ ہیں جو نظامِ خداوندی کے دشمن ہیں۔ ان دونوں آیات سے واضح ہوگیا کہ جو لوگ اللہ کے دین کے دشمن ہیں وہ اللہ کے دشمن ہیں۔ جو لوگ اللہ کے دین کی مخالفت کرتے ہیں وہ اللہ کے دشمن ہیں۔ تو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں وہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دین کے دوست ہیں اور اللہ کا دین قائم کرتے ہیں۔ قرآن کی نگاہ میں جو اقامتِ دین میں ایک رکاوٹ ہیں ان کی یہ عزت و توقیر اور ان کا یہ بلند مقام مذہب زدہ، اور مذہب خوردہ لوگ ہی کرسکتے ہیں۔ دین کے سامنے تو ان کی پرِکاہ

عزت وتوقیر نہیں ہے۔

جس قدر عقلِ انسانی ترقی کر رہی ہے۔ دنیا میں اسی قدر دہشت گردی، تشدد، فساد، خوف و ہراس بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے ایک آدمی لاٹھی سے ایک آدمی کو مار سکتا تھا۔ اب بم اور دوسرے ذرائع سے ایک آدمی آدھی دنیا کو تباہ کر سکتا ہے۔ البتہ اگر عقلِ انسانی وحی پر مبنی نظام کو قائم کرے تو ساری دنیا میں امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔ آج انسان کو سب سے زیادہ امن کی تلاش ہے۔ لیکن امن ناپید اور عنقا بن گیا ہے۔ اس کا واحد علاج قرآنی نظام ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ نظام دنیا کو پوری انسانیت کے لیے امن کا گہوارہ بنا سکتا ہے ارشادِ باری ہے فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ (2:38) ترجمہ: وہ عقل جو اس سے بیشتر جذبات کے پیچھے چل رہی تھی اب خدا کی طرف سے دی ہوئی راہنمائی کے پیچھے چلے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف و ہراس بھی نہیں رہے گا اور اس قوم پر حزن بھی نہیں رہے گا۔ خوف خارج سے آنے والے خطرات سے ہوتا ہے اور حزن دل کے اندر پیدا ہونے والی بے چینی کو کہا جاتا ہے۔ خوف کسی واقعہ کے وجود پذیر ہونے سے پیشتر ہوتا ہے۔ حزن کسی MISHAP کے واقع ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ حزن خوف کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ سورہ نور میں اس سے ذرا زیادہ واضح طور پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ اس دنیا میں اقتدار حاصل ہونا ہوتا ہے۔ جو قوم بھی اللہ پر ایمان لائے گی اور اعمال صالحہ سرانجام دے گی، تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اس دنیا میں اقتدار عطا کر دے گا۔ اس قوم کو اقتدار ملنے کے بعد اس قوم میں بدامنی اور خوف کے بجائے امن وسکون پیدا ہو جائے گا وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (24:55) ترجمہ: اور اللہ ان کے خوف کو امن میں تبدیل کر دے گا۔ آپ غور فرمائیں کہ اس نظام کے قیام کے بعد امن جیسی نعمت مل جاتی ہے اور اس سے بڑی نعمت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے۔ یہ اس نظام کے قائم ہونے کا نتیجہ ہے جو قرآن ہم کو عطا کرتا ہے۔

امن کے بعد دوسری اہم ترین چیز رزق اور رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ کوئی فرد ہو یا کوئی قوم ہو، قوانین خداوندی اور اللہ کے عطا کردہ نظام کی خوشگواریاں اور اس کے ثمرات تو ہر کسی کے لئے ہر دور انسانیت میں برابر ہوں گے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (5:66) فرمایا کہ اپنے اپنے وقت میں خدا کی جو صحیح تعلیم ان تک آتی رہی اور اگر یہ تورات وانجیل کا نظام قائم کرتے تو یہ اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے رزق کھاتے۔ یعنی یہ کہ ان کے معاشرہ میں رزق کی خوب فراہمی ہوتی مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (5:66) کی تشریح دوسرے مقام (7:96) میں ان الفاظ میں کر دی کہ: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (7:96) تو ان پر سماوارض کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ یعنی اس نظام میں ارض کی برکات بھی ملتی ہیں اور سماء کی برکات بھی ملتی ہیں۔ یعنی یہ نظام انسان کی جسمانی زندگی کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے اور اس کے علاوہ انسانیت کی جو ضروریات اور اس کے تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کرتا ہے۔

تورات اور انجیل کے نظام کی طرح قرآنی نظام کی بھی یہی کیفیت ہے فرمایا وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) ترجمہ: زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ آسمان پر روٹیاں پکوا کر پھینکوا دیتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے اس نے فرمایا یہ رزق کا سامان تو انسان کے پیدا ہونے سے پیشتر مہیا کر دیا گیا تھا۔ سارا مسئلہ تقسیم رزق کا ہے جو نظام کے ذریعے ہوتا ہے۔ قرآنی نظام قائم ہی ان خطوط پر کیا جاتا ہے کہ جس میں ہر شخص کو رزق ملتا رہتا ہے اور کوئی شخص اس میں رزق سے محروم نہیں رہتا۔ حضرت عمرؓ نے یہی فرمایا تھا کہ اگر عمر کی مملکت میں فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمر سے اس کی باز پرس ہوگی کیونکہ خدا نے دابہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں ہر چلنے والا شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر کسی بستی میں ایک شخص رات بھر بھوکا سویا، تو اس پوری بستی سے اس مملکت کی اطاعت مرفوع ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے فرمایا کہ کوئی آئیڈلوجی تقسیم نہیں ہونی چاہئے۔ اس پر مجموعی طور اور کُلی طور پر عمل کیا جاتا ہے فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (2:85) ترجمہ: کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لائے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو۔ سنو تم جو یہ کام کرتے ہو اس کی سزا کوئی نہیں سوائے دنیا میں رسوائی کے۔ قرآنِ کریم نے معاشیات کے جو اصول دیئے ہیں ساتھ ساتھ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے تاکہ رزق کی صحیح تقسیم ہو سکے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زمین تمام پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے اس لئے زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں ہے۔ ارشادِ عالی ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (15:20) ہم نے زمین کے اندر تمہارا رزق رکھا ہے۔ ہم نے اس سامان معیشت کو تمام نوع انسانی نے کے لئے رکھا ہے۔ مزید ارشاد ہوا وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ (55:10) اس نے زمین لوگوں کے لئے بنائی۔ اس موضوع کے متعلق اس قدر آیات ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے لیکن ایک عقلی دلیل ہے کہ زمین پہلے وجود میں آئی، اور انسان اس کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوا ہے۔ انسان سے پیشتر یہ کس کی ملکیت تھی۔ جو لوگ طاقت اور قوۃ رکھتے ہیں انہوں نے اپنی طاقت کے مطابق زمین پر قبضہ کر لیا اس سے ان کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے (2:119) اور تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ کہہ دے جو اپنی ضروریات سے بچے۔ اس ایک لفظ میں اسلام کا سارا معاشی نظام آ جاتا ہے۔ جس پر اب کتابیں تحریر کی جا رہی ہے۔ اسلام کا معاشی نظام ایک طویل مضمون ہے جس پر بہت تحریر کیا جا چکا ہے۔ یہ مضمون طویل بھی ہو گیا اور اس کے موضوع میں یہ نہیں ہے۔ لیکن اس موضوع پر الگ مضمون پیش کر دیا جائے گا۔

عبداللہ ثانی، پشاور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تبصرۂ کتب

قرآن: جدید تحقیقات کی روشنی میں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّالۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۷﴾ (31:27)

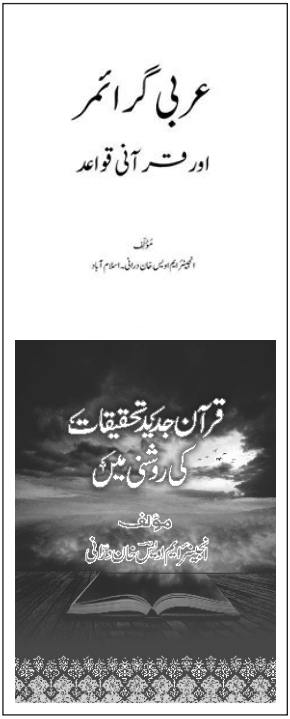
ترجمہ: اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر (کا تمام پانی) اور سیاہی ہو جائیں تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔ بے شک خدا غالب حکمت والا ہے۔

مفہوم: اس کائنات کی وسعتوں اور قوانین خداوندی کی حدود فراموشیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے درخت قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سب روشنائی میں تبدیل ہو جائیں اور ان کے ساتھ کئی اور سمندر بھی ملا دیئے جائیں ___ تو بھی ان قوانین کا احاطہ نہ ہو سکے اور یہ قوانین جہاں اتنی قوت رکھتے ہیں کہ اس قدر عظیم القدر نظامِ کائنات کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکیں اس کے ساتھ ہی یہ علم وحکمت پر مبنی ہیں۔ یونہی اندھی قوت کی بناء پر نافذ العمل نہیں۔

قرآن کریم پر آج تک جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا احاطہ کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا جائے گا۔ قرآن کریم ان بھیدوں کو آشکار کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ مسلمانوں نے اگر قرآن کریم پر تفاسیر کی حد تک کام کیا ہے تو مستشرقین بھی کم پیچھے نہیں رہے اور یہی وہ اعجاز ہے جو صرف اور صرف قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اِن عظیم الجثہ تحقیقات میں جناب انجینئر محمد اویس خان درّانی صاحب کی زیرِ عنوان تالیف ''قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں'' نے گراں قدر اضافہ کر کے قرآن کریم سے عشق رکھنے والوں کے لیے مزید تحقیق کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ کتاب میں تقریباً تین سو موضوعات میں سے ہر ایک پر زیادہ سے زیادہ دو تین صفحات میں قرآن کی آیات سے جواب مہیا کیا گیا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے یہ محاورہ اس کتاب پر پورا اُترتا ہے۔ اگرچہ کتاب عام فہم ہرگز نہیں لیکن یونیورسٹی لیول اور ریسرچ کنندگان کے لئے بنا بنایا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ کتاب کو حوالہ / ریفرنس بک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کتاب کا مطالعہ بہت کم ہوتا جا رہا ہے جس سے بات کرو یا کسی موضوع پر اظہارِ خیال کا موقعہ آتا ہے تو فوراً جواب دیا جاتا ہے ''ذرا نیٹ پر دیکھتے ہیں۔ نیٹ جس کا ترجمہ ''جال'' ہے۔ ''جال'' میں پھنسا ہوا جواب کب کتاب کے برابر ہو سکتا ہے؟ کتاب کا پس منظر یقیناً دلچسپی کا حامل ہوگا۔

یہ سال 2002ء کی بات ہے۔ راقم قدیر احمد خان مرحوم کی بیمار پرسی کے لیے گیا تھا۔ مرحوم کے بستر کے تینوں اطراف کتابوں سے اٹے پڑے تھے۔ کہنے لگے آج آپ کی ملاقات ایک عاشق قرآن سے کرواتا ہوں۔ قدیر احمد خان مرحوم کو

اقبال مرحوم کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے۔ ابھی یہ بات ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ آجاؤ! سلام کے ساتھ ہی ایک شخصیت نے کہا۔ ''گل کلام ہے۔ ایک گھنٹے کی ملاقات میں ہم تھے جناب انجینئر محمد اویس درّانی تینوں کی سوئی قرآن کریم پر اٹکی ہوئی ہوتی رہی۔ اُس کے بعد اچانک یہ مارچ 2017ء کو گھنٹی بجی۔ میں نے لگے میں نے تیرہ سو صفحات پر مشتمل معلوم ہوا درّانی صاحب بحر قرآن میں تحقیق کی روشنی میں'' اور ''عربی گرائمر'' نے دس سال کی محنت شاقہ کے بعد روشنی میں ایسا ٹٹولا کہ جس کا جواب افادیت پر آگے بات کروں گا۔ دس طرف جانے والے راستے کا انتخاب



گلزار'' جلد ہی معلوم ہوا کہ یہ آپ کا دعائیہ تکیہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ یہ صاحب جو میخانۂ پرویزؒ کے بادہ کش تھے۔ ہم تھی۔ چار پانچ سال تک ٹیلیفون پر بات چیت سلسلہ رک گیا۔ دس سال گزر گئے۔ آواز پہچانی، ساتھ ہی کہنے لگے ''گل گلزار'' کہنے ایک کتاب تالیف کی ہے۔ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ غوطہ زن تھے۔ نکلے تو دو کتابیں ''قرآن جدید کی کتاب ہاتھ میں لیے تھے۔ درّانی صاحب تقریباً بائیس مشہور زمانہ کتابوں کو قرآنِ کریم کی نہیں۔ سوچتا ہوں کہ بہت بڑا کام کیا۔ کتاب کی سال میں درّانی صاحب نے بہشت بریں کی کیا۔ راقم نے اس دوران کیا کیا؟

شوگر کی وجہ سے آدھی بتیسی ہار گیا۔ خون میں اتنی شوگر ہے کہ مجھے کسی کارخانے کو لگانے کی ضرورت نہیں۔ رعشے نے دونوں ہاتھوں پر حملہ کیا ہے۔ لکھنا اور بولنا دشوار ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ قبل دونوں آنکھوں کے سامنے مچھروں کے غول دوغول ہوا میں اُڑتے نظر آتے رہے۔ دو دن مسلسل تالیاں بجاتا رہا۔ یہ کیسے مچھر ہیں ایک بھی ہاتھ نہیں آتا۔ آخر شکایت کی تو ڈاکٹر نے کہا دونوں آنکھوں میں موتیا اُتر آیا ہے۔ یہ مچھر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! میں نے تو گلاب کی تمنا کی تھی۔ کہنے لگے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ کی خواہش گلاب کے قطروں سے پوری کردوں گا۔ دن میں تین بار قطرے ڈالیئے میں نے کہا اس کا علاج۔ کہا اپریشن، پوچھا کب؟ کہا جب تک شوگر ڈاؤن نہ ہو۔ اب شوگر نے دونوں ٹانگوں کو بھی گھیر لیا۔ دس منٹ کھڑا نہیں ہوسکتا ہوں۔ یہ تھی میری دس سالہ کارگردگی اور دوسری جانب محترم درّانی صاحب بحر قرآن میں ایسے غوطہ زن ہوئے، نکلے تو دو انتہائی پُرمغز کتابیں لہراتے ہوئے نکلے۔ ''قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں''، تخلیق آدم سے لے کر عروجِ آدم خاکی کے ان تمام ارتقائی عوامل پر مختصر اور جامع انداز میں جو کچھ بتایا گیا ہے۔ ایک عرصہ تک شاید کوئی اس کے مقابل آئینہ رکھے۔ کسی نے اگر جرأت بھی کی تو وہ درانی صاحب کی تالیف کا چربہ ہوگا۔ کتاب سے قاری کے لیے اقتباس پیش کرنا خود ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ بہرحال ''مشتے از خروارے'' کے مصداق ایک چھوٹا سا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ارتقاء کے حوالہ سے درّانی صاحب نے قرآنِ کریم کی سورۃ الانعام آیت 98 کا حوالہ دیا ہے۔ ''ارتقاء'' وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) ''نظریہ ارتقاء کی بنیاد یہ ہے کہ زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے یہ اپنے اولین جرثومہ سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن مسلسل حرکت نہیں کئے جاتی۔ ایک منزل میں آکر تھوڑی دیر کے لیے

رکتی ہے۔ وہاں کے ماحول سے سامان نشوونما اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ اور جب اس میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو پھر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ رکتی اور چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہیں: فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) جو بڑی جامع اور لطیف اصطلاحات ہیں۔ جب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی کسی جگہ رک جائے تو اسے قرار کہتے ہیں۔ رکی ہوئی تو منجمد شے بھی ہوتی ہے لیکن اس کے لیے قرار کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ یہ لفظ صرف متحرک اشیاء کے عارضی طور پر رک جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس رکنے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسے مُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کسی کی امانت کسی کے سپرد کرینا ''یعنی یہ چیز اس منزل کے پاس جو اس کا ''فَمُسْتَقَرٌّ'' تھا۔ فطرت نے بطورِ امانت رکھی تھی۔ اس نے وہ امانت اس کے سپرد کر دی جس کی وہ امانت تھی۔ اس طرح فَمُسْتَقَرٌّ اور مُسْتَوْدَعٌ کی منزلیں طے کرتی ہوئی، زندگی سلسلہ ارتقاء کی آخری حدود تک پہنچ گئی۔ سائنس کے اس مشکل مضمون کو بھی قرآن نے کس قدر شاداب وشگفتہ انداز میں پیش کر دیا۔ لیکن یہ حقائق صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو تفقہ (غور وفکر) سے کام لیں۔

زندگی کی اگلی بلند منزل مُسْتَوْدَعٌ ہے۔ اگر جدوجہد جاری رکھے تو یہی مُسْتَوْدَعٌ اس کا مستقر بن جاتا ہے اور اسے اگلی منزل میں پہنچا دیتا ہے۔'' صفحہ 301۔ کتاب ہذا میں ارتقاء سے متعلق کئی باب ہیں۔ ارتقاء کی منازل کو قرآن کریم کی کئی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں کتاب کا موضوع ہی ارتقاء ہے۔ ویسے تو ایک اقتباس کافی نہیں لیکن کیا کیا جائے بس پوری کتاب پڑھنے سے یہ مشکل ترین مسئلہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس گل گلزارِ قرآن سے مؤلف نے جن پھولوں کو چنا ہے قابل رشک ہیں۔ ایک چھوٹا سا اقتباس صفحہ 805 سے پیش کرتا ہوں۔ اس میں یقین کی تین منازل بتائی گئی ہیں۔

علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین

''قرآن نے تمام توہم پرستیاں، پیشگوئیاں، قسمتوں کا حال، علم لدّنی وغیرہ آ کر ختم کر دیا۔ قرآن نے یقین کے تین درجے بتائے ہیں۔ پہلا علم الیقین، یعنی آنکھوں سے دیکھ لینا مگر یہ آخری درجہ نہیں۔ جیسے آگ کا دھواں اٹھتا ہے تو ہم علم کے ذریعے اندازہ لگاتے ہیں کہ آگ ہے۔ جب سامنے بھڑکتی نظر آئے تو عین الیقین۔ جب اس میں انگلی ڈال دو تو وہ جلا دے یہ ہے حق الیقین۔

آئندہ ایڈیشن کے لیے راقم صرف تجاویز دے سکتا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ عام قاری اسے برداشت کرنے سے رہا۔ اگر اسے دو جلدوں میں کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ بہت ضروری تھا۔ اس طرح یہ عام فہم بھی ہو سکتی تھی۔ علامہ اقبال مرحوم کے فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ بہت ضروری تھا۔ اگرچہ اس سے کتاب کی ضخامت اور بھی بڑھ جاتی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ کتاب عام فہم ہو جاتی۔ بہرحال کتاب کے لیے راقم الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ وجہ کم مائیگی رہی۔

کتاب ''قرآن، جدید تحقیقات کی روشنی میں'' اعلیٰ سفید کاغذ کے 1288 صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مبلغ -/1200 روپے ہے۔ اسی طرح کتاب ''عربی گرامر اور قرآنی قواعد'' اعلیٰ سفید کاغذ کے 559 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور قیمت -/500 کچھ زیادہ نہیں۔ یہ دونوں کتب مندرجہ ذیل فون نمبر پر رابطہ کر کے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر12)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

گویا حیوان کا شعور اپنے آپ سے آگاہ نہیں، لیکن انسان کا شعور اپنے آپ سے آگاہ ہے۔

دوسرے الفاظ میں ہم اس حقیقت کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں۔ کہ حیوان فقط شعور کا مالک ہے لیکن انسان خود شعوری سے بہرہ ور ہے۔

2۔ حیوان اپنی جبلتوں کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ ان کے طبیعی مطالبہ کو روک نہیں سکتا۔ اور ان کو اپنے اختیار و ارادہ سے تشنہ یا غیر مطمئن نہیں رکھ سکتا۔

انسان اپنی جبلتوں کی مخالفت کرسکتا ہے۔ ان کے طبیعی مطالبہ کو روک سکتا ہے اور اپنے اختیار و ارادہ سے ان کو تشنہ اور غیر مطمئن رکھ سکتا ہے۔

3۔ حیوان اپنی کسی جبلت کو اس کے طبیعی مطالبہ سے زیادہ مطمئن نہیں کرتا۔

انسان اپنی جبلتوں کو ان کی ضروریات اور طبیعی حدود سے زیادہ مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حیوان جبلتوں کی لذت کے لیے اتنی ہی کشش رکھتا ہے جتنی کہ ان کی طبیعی فعلیت (Natural activity) کے ساتھ وابستہ کی گئی ہے لیکن انسان کی یہ کشش حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

4۔ انسان محض آدرشوں (Ideas) کی خاطر یعنی ان کی کشش اور محبت سے مجبور ہو کر آدرشوں کی طلب اور جستجو کرتا ہے اور ان کے لیے جبلی تقاضوں کو قربان کرتا ہے۔

حیوان کے اندر کوئی ایسا جذبہ عمل موجود نہیں:

5۔ انسان علم کی خاطر علم کی جستجو کرتا ہے۔

حیوان کے اندر بے شک ایک ذوقِ دریافت (Curiosity) موجود ہے لیکن یہ ذوق اس کی جبلتوں کی خدمت اور اعانت کے لیے اپنی تشفی چاہتا ہے۔

انسان کے اندر صداقت یا علم کی تلاش خود صداقت یا علم کی غرض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے نہیں ہوتی۔

6۔ انسان، حیوان کے برعکس اخلاقی اقدار کو ان اقدار ہی کے لیے چاہتا ہے اور ان کے حصول کی کوشش میں وہ اس

بات کی پروانہیں کرتا کہ اس کے تقاضے ٹھیک طرح سے مطمئن ہو گئے ہیں یا نہیں۔

7۔ انسان حسن کو حسن کے لیے آزادانہ طور پر طلب کرتا ہے اور اپنے کاموں میں حسن کا اظہار کرتا ہے جبکہ حیوان ایسا محض جبلت کے طور پر کر سکتا ہے۔

8۔ انسان کے عواطف (Emotions) حیوان کے عواطف کی نسبت بہت زیادہ متنوع ہیں۔

9۔ صوفیاء اور عبّاد کو ایک ایسا روحانی تجربہ (Mystic Experience) حاصل ہوتا ہے۔ جس میں ان کی مسرت یا خوشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ کسی جبلت کی تشفی اس قسم کی مسرت یا خوشی پیدا نہیں کرتی۔ لہٰذا حیوان اس مسرت سے قطعاً بے نصیب ہیں۔

انسان اور حیوان کی درج بالا تمیز سے، برگسان کی یہ وضاحت مزید تقویت حاصل کر لیتی ہے کہ حیوان اور انسان میں باہمی فرق نہ تو درجات کا ہے اور نہ ہی شدت کا۔ ان میں نوعی فرق ہے۔ ''یعنی ایں چیزے دیگر است''۔

بنیادی طور پر انسان غور و فکر سے اپنے ارادے پر اختیار رکھتے ہوئے اعمال تخلیق کرتا ہے۔ اس لیے عقل کی رو سے سرزد تمام اعمال انسان سے منسوب ہوتے ہیں۔ یہ اُسی کے انتخاب کا حصہ ہوتے ہیں اور انہی اعمال کی جزا کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

اس کے برعکس حیوان میں نہ تو غور و فکر کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے اختیار سے انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ جبلی تقاضوں سے مجبورِ محض ہونے کے ناطے سے ذمہ دار نہیں کہلاتا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کے فرق کو حیوانی اشتہات اور انسانی خواہشات کے ذریعے سامنے لایا جائے۔ بنیادی طور پر نباتات کی ضروریات کے لیے احتیاج (Want) کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جانوروں کے لیے اشتہا (Appetite) کا اور انسانوں کے لیے خواہش (Desire) کا۔ نباتات میں صرف احتیاجات ہوتی ہیں۔ رجحان اور غایت دونوں کا شعور نہیں ہوتا۔ جانوروں میں احتیاجات اور اشتہا، دونوں موجود ہوتے ہیں اور رجحان کا شعور بھی کسی قدر ہوتا ہے لیکن غایت کا علم نہیں ہوتا۔ انسانوں میں احتیاجات، اشتہا اور خواہشات تینوں ہی موجود ہوتی ہیں اور انسانی خواہش میں رجحان اور غایت دونوں کے متعلق شعور ہوتا ہے۔ وہ خواہشات پورا کرنے کے ذرائع کے بارے میں جائز اور درست کی تمیز بھی رکھتا ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے نہ زندگی بے جان مادہ میں کیمیائی اور طبیعاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی انسانی شعور حیوانی دماغ کے میکانکی ارتقاء کی اگلی منزل۔ زندگی اور شعور کی تخلیق خدا کی حکمت میں پوشیدہ ہے۔ اسی اپنی ربوبیت سے وہ اسے اس کے منتہیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔ حکمائے مغرب نے جن امور کا تحقیق سے انکشاف کیا ہے، درحقیقت وہ طبیعی قوانین ہیں، جن کے مطابق خالق کائنات اس تمام کارگہِ ہستی کو چلا رہا ہے اور جن کے مطابق ایک جرثومہ حیات مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے پیکر انسانی تک پہنچا ہے۔ لیکن وہ انسان کی موجودہ زندگی کے ارتقاء کے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی کا انکشاف نہیں کر سکے۔

انسانی تخلیق کی ابتدائی کڑیاں تو اس سلسلہ کے مظاہر ہیں، جن کی رُو سے دوسرے حیوانات کی پیدائش ہوتی ہے لیکن

اس کے بعد انسانی تخلیق ایک یکسر نئے دائرے میں داخل ہوتی ہے، جو پچھلی کڑیوں کا طبعی نتیجہ نہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی مطالعہ کر چکے ہیں، اس مقام پر اس میں روح خداوندی (Divine Energy) کا شمہ ڈالا جاتا ہے اور اس طرح اسے صاحبِ شعور وبصیرت اور اختیار وارادہ کا مالک انسان بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ روحِ خداوندی ہے جس سے انسان اپنی مستقل انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کو انسانی ذات، نفس، خودی، انا یا ایغو کہا جاتا ہے۔

اگلے ابواب میں صاحبِ شعور وبصیرت اور اختیار وارادہ کا اختیار رکھتے ہوئے ارتقائی مرحلہ میں انسانی ذات کے مقام تک رسائی کے مقام کا جائزہ لیا جائے گا۔

دوسرا باب

آدمی کی طبیعی/حیوانی زندگی سے انسانی ذات کی صورت میں ارتقاء

اِس باب کے آغاز میں اِس دنیا میں ارتقاء کی آخری کڑی کے طور پر انسانی ذات تک پہنچنے کے سفر کا تجزیہ لیا جائے گا۔

نظریہ ارتقاء میں حکمائے مغرب کا موقف:

حکمائے مغرب کے نزدیک زندگی مادہ میں بعض کیمیائی اور طبیعاتی تبدیلیوں سے اتفاقی طور پر پیدا ہوگئی اور حیوانی پیکر کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد حیوانی دماغ میں بھی بعض قسم کی تبدیلیوں سے شعور پیدا ہو گیا اور یوں خاک کے ذرّے جیتے جاگتے باشعور انسان کی صورت میں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ میکانکی ارتباط منتشر ہو جائے گا تو زندگی اور شعور سب ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا زندگی یہی طبیعی زندگی ہے اور اس کا تحفظ واستحکام، انسان کا نصب العین اور ارتقاء کا نقطہ ماسکہ ہے۔

اس کے برعکس قرآن کریم کی رُو سے نہ زندگی بے جان مادہ میں کیمیائی اور طبیعاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی انسانی شعور حیوانی دماغ کے میکانکی ارتقاء کی اگلی منزل۔

زندگی اور شعور کی تخلیق خدا کی حکمت میں پوشیدہ ہے۔ اسے اپنی ربوبیت سے وہ اس کے منتہیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔ حکمائے مغرب نے یہ نظریہ جن امور کی تحقیق سے ترتیب دیا ہے، وہ درحقیقت وہ طبیعی قوانین ہیں، جن کے مطابق ایک جرثومہ حیات مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے پیکر انسانی تک پہنچا ہے۔ اِس کے برعکس اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی انسانی ذات زمان ومکان اور علت معلول کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اِنسانی ذات آزادیِ ارادہ اور تعقل کی صِفات کی حامل غیر مرئی قوت ہے، جس کا حکمائے مغرب ابھی تک انکشاف نہیں کر سکے۔ قرآن کا موقف ہے یہی انسانی ذات مناسب نشوونماء کے حصول کے بعد حیات بعد الممات میں ایک نئی زندگی میں مزید ارتقاء کے مراحل طے کرنے کی اُمیدوار بننے کی حامل ہے۔

قرآن میں بتدریج نظریہ ارتقاء کے مراحل کا تذکرہ:

خدا نے زندگی کو مٹی کے خلاصے سے لے کر آج کی حالت تک پہنچانے کے لئے مختلف مراحل سے گزارا۔ پیدائش سے پہلے حیوان بشمول انسان، ان ہی تمام مراحل سے گزرتے ہیں۔ حیوانات کے مراحل تو یہاں آ کر ختم ہو جاتے ہیں، لیکن انسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ ہی نفخِ روح سے آزادیِ ارادہ کی قوت دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے یہ دیگر حیوانات سے ایک مختلف اور جدید مخلوق بن جاتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ:

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝۸ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۹ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ (32:7-10)

اُس نے ہر شے کی تخلیق میں حسن و توازن رکھا، اور اس نے انسان کی خلقت کا آغاز بے جان مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل کو بذریعہ تولید، ایک حقیر پانی کے خلاصہ سے چلایا (یعنی نر اور مادہ کے اختلاط سے چلایا)۔ پھر اس میں صحیح صحیح توازن و تناسب قائم کیا، اور اس کو اپنی توانائی کا شمہ (خوابیدہ شکل میں) عطا کیا، اور تمہارے لئے سماعت و بصارت اور قلب بنائے۔ لیکن بہت کم لوگ ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ (حیرت سے) کہتے ہیں کہ جب ہم مرنے کے بعد زمین (خاک) میں رل مِل جائیں گے، تو ہمیں پھر سے ایک نئی زندگی ملے گی؟ یہ نہیں کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال کی جوابدہی سے بچنے کے لئے خدا کے قانونِ مکافات کا انکار کرتے ہیں۔

ذات کا آغاز اس نے ارض یعنی مٹی، ایک بے جان مادہ (Inorganic Matter) سے کیا۔ اس بے جان مادہ کے ساتھ پانی کی آمیزش سے طین لازب بنی تو اس میں زندگی کے اوّلین جرثومہِ حیات (Life Cell) جسے قرآن نے ''نفس واحدہ'' کہا ہے کی نمود ہوئی۔ اس کے بعد یہ کاروان حیات، مختلف مراحل طے کرتا ہوا، اس وادی میں آ پہنچا جہاں افزائش نسل (Procreation) بذریعہ تولید یعنی نر اور مادہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ پھر خدا نے (آئندہ مراحل طے کرانے کے قابل بنانے کے لئے) بچے میں صحیح صحیح توازن و تناسب قائم کیا۔ اس مرحلہ تک یہ طریق تخلیق حیوانات اور انسانوں میں مشترک چلا آتا ہے۔ اس کے بعد، انسان کی صورت میں، ایک انقلابی تبدیلی یعنی فجائی (Emergent Evolution) واقع ہوتی ہے۔ فجائی تبدیلی کے بعد خدا، انسان کو اپنی الوہیاتی توانائی یعنی روح (Divine Energy) کا ایک شمہ عطا کر دیتا ہے۔ اس الوہیاتی توانائی کے شمہ کو اسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے۔ اس طرح خدا انسان کو سماعت و بصارت یعنی علم الحواس کے ذرائع (Perceptual knowledge) عطا کر دیتا ہے، اور ساتھ ہی

''دل'' (Mind) بھی، جسے قرآن فؤاد کہتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کے شکر گزار ہوتے ہیں یعنی ان صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔

اِس آیت کے مفہوم کا ماحصل یوں ہے کہ:

1۔ ارض پر زندگی (Life) کی ابتداء پانی سے ہوتی ہے۔

2۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اولین کو پیکر عطا ہوا۔

3۔ زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

4۔ اِن جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

5۔ ان طویل المعیاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا، جسے تخلیق حیوانی بذریعہ تولید کہتے ہیں۔

یہ سب ارتقاء کے مراحل یونہی اتفاقیہ رونما نہیں ہو رہے بلکہ ایک مقصد کے تحت ایسا ہو رہا ہے۔ یہ مقصد محض مقصد ہی نہیں بلکہ یہ مقصد ایک خود شناس شعور اور ایک خلاق، قدیرِ مطلق خدا کی ذات کا طے کردہ ہے، انسانی طبیعی مادی پیکر میں آنے کے بعد زندگی کو ارتقاء کی آخری کڑی سمجھنے کے برعکس قرآن سے انسانی حیات کے ارتقاء کی راہنمائی یوں ملتی ہے کہ:

1۔ حیوانی زندگی اِسی قسم کے غیر محسوس، اور طویل المعیاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بمنزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

2۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے بتایا جائے گا کہ انسانی پیکر میں آنے کے بعد اِس میں مزید ارتقاء کے لئے، اِسے بشریت کی حد تک علم کی صلاحیت ودیعت کرنے کے ساتھ اختیار وارادہ میں آزادی سے انتخاب کی قوت دے کر انسانی ذات نفس کے نام سے اِس ارض میں ایک نئی تخلیق کے طور پر متعارف کرایا گیا۔

3۔ نشوونما یافتہ انسانی ذات کا مزید ارتقاء موت کے بعد نئی اور اس سے بہتر حیات کے حصول کے لئے امیدوار بن کر ہوگا۔

عصرِ حاضر کے علمائے طبیعات کے نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جس شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے، اپنی ابتدائی شکل میں اس حالت میں وجود نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ حیات، مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے، اس مقام تک پہنچا ہے۔ ہم ابھی اس کی تائید میں قرآنی آیات کے حوالے بھی دیکھ چکے ہیں۔ اس تائید وتوافق کے باجود حکمائے مغرب اور قرآن کے نظریہ میں بنیادی فرق بھی ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں میں ہم آہنگی ہونا ناممکن ہے۔

حصولِ ذات سے انسان کا بطور جدید مخلوق کا قرآنی تصور:

حیوانی زندگی سے انسانی ذات تک کے ارتقائی مرحلہ کے حصول کی مزید وضاحت قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے کہ:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (23:14)

پھر پانی (نطفے کے جرثومے) کو علقہ (جنین یعنی جونک کی سی شکل) میں تبدیل کیا، پھر علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنایا، پھر

اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا، پھر ہڈیوں کے ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی۔ (پھر پیدائش کے ساتھ ہی نفخ روح (32:9-7) کرنے کے بعد) انسان کو، ایک بالکل نئی قسم کی مخلوق کی شکل میں نمودار کر دیا۔ سو دیکھو خدا کا قانونِ تخلیق کتنی بڑی ممکنات (برکات) کا حامل ہے۔ خدا کی تخلیق صحیح توازن وتناسب میں ہوتی ہے، اس لئے وہ خود احسن الخالقین ہے۔

حیوانات کے مراحل تو یہاں آ کر ختم ہو جاتے ہیں، لیکن انسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ ہی نفخ روح سے ذات عطا کر دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے یہ دیگر حیوانات سے ایک مختلف مخلوق بن جاتا ہے۔

جب تک حیوانی انسان یا آدم میں نفخ روح نہ کی گئی، اس میں ''مَیں'' نہیں آئی تھی کہ اُس کو ''تُم'' کہہ کر پکارا جائے، اسی لئے انسانی تخلیق کے اُن مراحل کا ذکر، جن میں انسان اور حیوانات دونوں شریک ہوتے ہیں، اُن میں انسان کے لئے غائب کی ضمیر Third Person لائی گئی مثلاً: ''نَسْلَهٗ'' (32:8)، ''سَوّٰىهُ'' اور ''فِيْهِ'' (32:9) جب روح یعنی صفات خداوندی انسان میں نفخ کر دی گئیں، اور انسان کو سماعت و بصارت اور قلب (فواد) عطا کر دیئے گئے، تو انسان میں ''مَیں'' آ گئی، اور یہ اب اس قابل ہو گیا کہ اس سے ضمیر غائب کی جگہ، مخاطب کی ضمیر مُتکلم ''لَکُم''، ''تُم'' کے ساتھ بات کی جائے۔ نفخ روح کی وجہ سے، انسان تخاطب کے قابل ہو گیا، یعنی اب یہ مخلوق انسان کہلانے کی مستحق قرار پا گئی۔ یہ جسے ہم ''تُم'' یا وہ جو اپنے آپ کو ''مَیں'' کہتی ہے، اس کو انسانی ذات کہتے ہیں۔

انسان اور حیوان کی طبیعی پیدائش یکساں ہے۔ سب انہی مراحل سے گزر کر پیدا ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ ابھی تک انسان کو ذات عطا نہیں ہوئی تھی تو قرآن نے انسان کے لئے ''تم'' یا ''تمہارے'' یعنی ضمیر مخاطب کا صیغہ استعمال کرنے کی بجائے، اس کے لئے درج آیت میں کہا ''اس کی نسل'' (32:8) اور ''اس میں'' (32:9) کے الفاظ یعنی ضمیر غائب استعمال کی ہے۔ انسان کی افزائش بذریعہ تولید، ذات کے عطا کیے جانے سے قبل لاکھوں سال تک جاری رہی۔ اس عرصہ میں طبیعی قوانین اور قانون ارتقاء کی رو سے اسمیں سے حشو وزوائد الگ ہوتے رہے، اور اس کا توازن وتناسب درست ہوتا رہا (32:9) جب توازن درست اور ذات کے حامل ہونے کے قابل ہو گیا، تو خدا نے اس کو ذات یعنی اپنی خوابیدہ توانائیوں کا شمہ عطا کر دیا۔ ذات کے ملنے کے بعد، یہ اس قابل ہو گیا کہ اس کو مخاطب کیا جائے۔

جو حیوان اپنے آپ کو ہم یا ہمیں یا میں نہ کہہ سکتا ہو، اس کو مخاطب بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس کو ذات عطا ہوئی تو فیصلہ کرنے کے لئے جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ (67:23) اب اس کو سمع و بصر یعنی حواسِ خمسہ عطا کر دیئے ہیں، تا کہ حواس باہر کی معلومات کو انسان کے اندر پہنچائیں اور وہاں کوئی فیصلہ ہو۔ فیصلہ کرنے کے لئے انسان کو الْاَفْـِٕدَةَ کی صلاحیّت دی گئی، جو حواس کے ذریعے ملنے والی اطلاعات پر مبنی فیصلہ کرتی ہے۔ الْاَفْـِٕدَةَ کو قرآن نے قلب بھی کہا ہے۔ انسانی جسم میں ذات (خودی، نفس یا پرسنیلٹی) اور الْاَفْـِٕدَةَ کا مقام کہاں ہے؟ ہم نہیں جان سکیں گے۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاودنامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

***Manzil ba Manzil* (منزل بہ منزل)**

Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک) – To my fellow travelers

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

For ages I wailed in Kaaba and in idol-temples for the advent of Life!
That, from among the community of devotees, a visionary might come!

Prophet Ismail (PBUH) had 12 sons. His second son *Qedaar* (قیدار) became quite well known and prominent among them. He settled in Hijaz and became the custodian of Kaaba that was built by Ibrahim (PBUH) and Ismail (PBUH). Prophet Ismail's descendants over time became a large community. They spread and expanded into large number of different tribes. The clan of *Quraish* (قریش) occupied the most superior and a unique special status among all the tribes.

Meaning of Quraish

Quraish (قریش) was the nickname of *Fahr* (فہر) (circa 325 A.D.), the son of *Qedaar* (قیدار). There are many meanings of word *Quraish* (قریش). The king of ocean, the whale, is also called *Quraish* (قریش) in Arabic. It is speculated that *Fahr* (فہر) kept this nickname because of his power and status. Among the Qureshi clan *Qasi Ibn Kalaab* (قصی ابن کلاب) (circa 475 A.D.) gained special fame because he laid down the political structure of this clan. He divided the management of Kaaba into different areas: arranging food and drink for pilgrims; creating security structure for Kaaba; instituting a system for pilgrims' financial help; creating a judicial system for resolving disputes; and establishing an assembly for political consultation and making collective decisions for running the affairs of *Quraish* (قریش). After *Fahr* (فہر) the next person that occupied a famous place among *Quraish* was Hashim. He was a gifted leader and fulfilled his duty as a great custodian of Kaaba. He signed treaties with Caesar of Rome and king Najashi of Abyssinia for tax exemption for Quraish's caravan passing through their territories. His son Abdul Muttalib (circa 550 A.D.) was also a great leader of Quraish who discovered the Zamzam well (that had disappeared over time) and restored it. He married his son Abdullah to Amina (daughter of Wahb bin Abd Manaaf) a well-respected lady of the clan of Zahra among the Quraish.

A radiant sun is born

In this respected and distinguished family, in the season of spring, on Monday, the ninth of Rabi-ul-Awwal (corresponding to April 20, 571 A.D.), in the morning, was born the sunshine of the world who was to remove all its

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
3

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



قومیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں

''آپ اچانک ایک نئی دنیا تخلیق نہیں کر سکتے۔ حصولِ آزادی کے لئے آپ کو ایک عمل سے گزرنا ہوگا۔ آپ کو آگ کے دریا، ابتلاء اور قربانیوں کی راہ سے گزرنا پڑے گا۔ مایوس نہ ہوں۔ قومیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں لیکن جیسا کہ ہم رواں دواں ہیں ہمیں ایسے قدم اٹھانے چاہئیں جو ہمیں آگے کی طرف لے جائیں۔ آپ حقائق کا مطالعہ کریں۔ ان کا تجزیہ کریں اور پھر اپنے فیصلوں کی تعمیر کریں۔''

(کلکتہ یونیورسٹی، پوسٹ گریجوایٹ طلباء سے قائداعظم کا خطاب، کلکتہ 21 اگست 1936ء)